ذوالقعدہ ۱۴۴۶ھ
مئی ۲۰۲۵ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

درس سُورۃ الفَاتِحۃ
اسلام میں خواتین کا مقام

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

زیر اہتمام: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))

”تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن مجید پڑھے اور پڑھائے۔“ (حدیث نبوی ﷺ)

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جامعہ کلیۃ القرآن لاہور (قرآن کالج)

وفاق المدارس العربیہ پاکستان سے الحاق شدہ

داخلے جاری ہیں

مڈل پاس طلبہ کے لیے
2 سالہ اولیٰ مع میٹرک

درس نظامی (درجہ اولیٰ تا دورہ حدیث) مع میٹرک،
ایف اے، بی اے، ایم اے اور بی ایس پروگرامز

خصوصیات:

- دینی وعصری علوم کا حسین امتزاج
- تجوید پر خاص توجہ
- بہترین قیام وطعام
- عربی تحریر وتکلم پر خصوصی توجہ
- باصلاحیت، قابل اور محنتی اساتذہ کی نگرانی
- ذہین طلبہ وعمدہ کارکردگی دکھانے والے طلبہ کے لیے وظائف
- تربیتی حوالے سے خصوصی پروگرامز
- دینی ماحول میں اعلیٰ تعلیمی معیار
- رہائشی طلبہ کیلئے فری لانڈری کی سہولت

ضروری کوائف برائے داخلہ:

- اولیٰ ومیٹرک کے لیے مڈل پاس سرٹیفکیٹ
- 4 عدد حالیہ تصاویر
- والد کے شناختی کارڈ کی کاپی
- ”ب“ فارم/ شناختی کارڈ کی کاپی
- داخلے کے لیے سرپرست/ والد کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

برائے معلومات:
دفتری اوقات کے دوران: 042-35833637
دفتری اوقات کے بعد: 0302-4471171 / 0301-4882395

191-اے، اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

المعلن: مہتمم: حافظ عاطف وحیدؒ — پرنسپل: مظفر حسین ہاشمی

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِيۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 74

شمارہ : 5

ذوالقعدہ 1446ھ

مئی 2025ء

فی شمارہ : 50 روپے

سالانہ زرِتعاون : 500 روپے

مُدیر

حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:

رضاء الحق، ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:

حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

ای میل: maktaba@tanzeem.org، 0301-1115348

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ''دارالاسلام'' ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا......

رضاء الحق

تذکرہ و تبصرہ — 9

اہلِ غزہ کی پکار اور ہمارا کردار

شجاع الدین شیخ

درس قرآن — 15

سُوۡرَۃُ الۡفَاتِحَۃِ

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اسلام اور خواتین — 38

اسلام میں خواتین کا مقام

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ظروف و احوال — 67

اسرائیلی مظالم اور فلسطین ولبنان کی حالت

ڈاکٹر محمد طیب خان سنگھانوی

دعوت و تحریک — 76

اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جِدّ و جُہد اور تحریک چلانا ضروری ہے یا نہیں؟

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا......

مئی کا مہینہ ہمارے لیے شمسی سال کے پانچویں مہینے سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ البتہ آج چند بہت زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کے سوا شاید کسی کو یہ علم نہیں ہے کہ رومن عہد میں اِس مہینے کی نسبت ''مایا دیوی'' سے منسوب تھی۔ اُن کے عقیدے کے مطابق یہ دیوی زرخیزی اور نشوونما لے کر آتی تھی۔ گزشتہ کم و بیش ڈیڑھ صدی سے مئی کا مہینہ مزدوروں کے حقوق کے حوالے سے نسبت حاصل کر چکا ہے۔ یکم مئی محنت کشوں کا عالمی دن ہے' جو ان کی قربانیوں پر خراجِ عقیدت پیش کرنے اور محنت کی عظمت کا احترام کرنے کے لیے منایا جاتا ہے۔ یکم مئی ۱۸۸۶ء کو امریکی ریاست شکاگو میں محنت کشوں نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے باقاعدہ جِدّوجُہد کرنے کا اعلان کیا اور اس کے لیے سینکڑوں جانوں کی قربانی بھی دی۔ ان کی قربانیوں کے نتیجے میں ۱۹۱۹ء میں عالمی ادارہ محنت (آئی ایل او) کے قائم ہونے پر محنت کشوں کے حقِ تنظیم سازی کو تسلیم کر لیا گیا۔

مزدور کسی بھی معیشت کی وہ بنیادی اکائی ہے کہ اِس کے بغیر کام کاج کا تصور بھی محال ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کے فضل کے بعد مزدور کی محنت ہی سے کائنات میں رنگ اور مارکیٹ میں مال دستیاب ہے۔ ایک مزدور کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ سے کام کرنے والے کو اللہ کا دوست قرار دیا ہے۔ تاہم آج مزدور صرف وہی نہیں ہے کہ جو اینٹ یا گارا اُٹھانے کا کام کرتا ہے بلکہ ہر وہ شخص مزدور تصوّر کیا جاتا ہے جو اُجرت پر کام کرتا ہے اور آجر اور مستاجر کے طے شدہ مفہوم کے تحت آتا ہے۔

امریکہ جو آج انسانی حقوق کا علم بردار بنا ہوا ہے' وہاں ایک صدی قبل حالات ایسے نہیں تھے۔ رنگ اور نسل کے علاوہ معاشی حالات کے حوالے سے بھی واضح تفریق نظر آتی تھی۔ ایک دیہاڑی دار مزدور اور غلام میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ مزدور کو اُس کی محنت کی اصل

اجرت ملتی ہی نہیں تھی‘ خصوصاً کارخانوں میں۔ آج وہاں صورت حال کچھ ایسی ہے کہ دنیا کو دکھانے کے لیے تو حالات بہت اچھے ہیں مگر اندر کھاتے حالات ایسے ہیں کہ مائیکروسافٹ جیسی عالمگیر کمپنی نے ایسے ملازمین کو صرف اِس لیے برطرف کر دیا کہ اُنہوں نے کمپنی کے کرتا دھرتاؤں کو یہ بتایا تھا کہ آپ کی اسرائیل نواز پالیسیوں سے انسانیت کو سنگین نقصان پہنچ رہا ہے۔

امریکہ آج کا ہو یا ماضی کا‘ اُس نے غریب اور محنت کش طبقے کی بجائے امیر اور سرمایہ دار طبقے ہی کی سرپرستی کی ہے۔ اِس پر مستزاد یہ کہ آج کا امریکہ اب ’’امریکہ فرسٹ‘‘ کی پالیسی کو اپنا چکا ہے۔ دوسری مرتبہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے موجودہ صدر نے اپنی انتخابی مہم میں اِسی نعرہ کو ہتھیار بنایا تھا‘ جو یقیناً کامیاب بھی ہوا ہے۔ گزشتہ ماہ جب امریکی صدر نے یہ اعلان کیا کہ وہ قومی مفاد میں امریکہ میں ہونے والی درآمدات پر ٹیرف میں اضافہ کر دیں گے تو ہمارے ہاں بہت سے لوگ یہی سمجھے کہ اس سے چین کو بہت زیادہ نقصان ہونے والا ہے۔ چین کے متوقع نقصان کی خبر کے انتظار میں بیٹھے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ اِس بڑھے ہوئے ٹیرف کی وجہ سے تو پاکستان کی اپنی معیشت زمین بوس ہوگئی ہے تو اُن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں خاص طور ۱۹۸۰ء کی دہائی کے بعد سے امریکہ پر اِنحصار اِس قدر بڑھ چکا ہے کہ دنیا میں اِس کی مثال ڈھونڈے سے نہ ملے۔ امریکہ بہادر کی پالیسیوں پر عمل درآمد ہی کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ کئی دہائیوں سے پاکستانی صنعت کا پہیہ بالکل جام ہو کر رہ گیا ہے۔ پاکستان جو کہ ایک زرعی ملک تھا‘ اِس کی زمینوں کو زراعت میں کھپانے کی بجائے امریکی پالیسیوں پر عمل کرتے ہوئے صنعتی استعمال میں لایا گیا۔ جب وہ صنعتیں اپنے جوبن پر پہنچیں تو اُن کی پیداوار کی منڈیوں کو محدود کر دیا گیا‘ حتیٰ کہ اپنے ملک میں بھی مقامی کی بجائے درآمدی مصنوعات سستے داموں ملنے لگیں۔ چند سال پہلے تک صورت حال یہ تھی کہ بازار میں بعض پاکستانی برانڈز کی عام مصنوعات غیر ملکی خاص برانڈز کی مصنوعات سے مہنگی ملتی تھیں۔ اوپر سے مہنگائی ایسی کہ عام آدمی ملکی مصنوعات کو ترجیح دینے کی بجائے چند روپوں کی بچت کے لیے غیر ملکی مصنوعات کو ترجیح دینے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کے صنعت کاروں نے یہاں اپنا کام بند کر دیا اور فیکٹریاں اونے پونے بیچ کر کسی ایسے ملک میں سرمایہ کاری کرنے چلے گئے جہاں اُنہیں کاروبار کرنے کے بہتر مواقع میسر تھے۔ فیصل آباد‘ گوجرانوالہ‘ لاہور‘ کراچی جیسے

صنعتی شہروں کے لاکھوں محنت کش بیکار ہوکر گھروں میں بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔ اُن میں سے کچھ تو ہاتھ پیر مارتے جائز و ناجائز طریقوں سے دیارِ غیر پہنچ کر اپنا اور اہلِ خانہ کے پیٹ کا دوزخ بھرتے رہے۔ پھر کرونا کی وبا پھیلی اور دنیا بھر میں صنعتیں اور کاروبار بند ہونے لگے تو ایک مرتبہ پھر اُنہیں بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ اگر جائزہ لیا جائے تو واضح طور پر نظر آ جاتا ہے کہ ہر موڑ پر غلط فیصلے اور غلط حکمت عملی اختیار کی گئی۔ مزدور اور کم مراعات یافتہ طبقے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا گیا جبکہ بااثر اور طاقتور طبقے یعنی اشرافیہ کو فائدہ دیا گیا۔ ملک کے حکمران مزدور طبقے کو دھوکا دیتے رہے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی سے پہلے بے شک پاکستان کی معیشت اس قدر مضبوط تھی کہ آج کے کئی بڑے ممالک کو قرض نہیں امداد دیا کرتا تھا' پھر حالات پلٹے اور ریکارڈ خسارے کے بجٹوں کا سلسلہ چل نکلا۔ آئی ایم ایف کا اونٹ غریب پاکستان کے خیمے میں گھس آیا۔ آج پاکستان کا غریب اور مزدور طبقہ آئی ایم ایف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے دن رات محنت کرتا ہے۔ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا جا رہا ہے۔ کبھی غریب اور امیر طبقے کے درمیان ایک بڑی تعداد متوسط طبقہ کی بھی ہوتی تھی' جو کم ہوتے ہوتے اب بالکل ختم ہی ہو گیا ہے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی ہی میں سکولوں میں طلبہ کے ذہن میں یہ بات بھی ڈالی جانے لگی کہ عام تعلیم حاصل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے' اِس کی بجائے پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کی جائے۔ ۷۰ء کی دہائی میں وہ مزدور جس نے یہ خواب دیکھا تھا کہ وہ اپنے بچے کو اعلیٰ تعلیم سے روشناس کرا کے معاشرے کا ایک کامیاب اور مفید شہری بنائے گا اور ہر وہ سہولت فراہم کرے گا جو خود اُسے تاحال حاصل نہیں ہو سکی' اُس کے تمام تر خواب چکنا چور ہو گئے۔ اُس کا بیٹا بھی اُس کی طرح کا ہی ایک مزدور بنا دیا گیا جبکہ اُس کے برعکس امیر اور مراعات یافتہ طبقے کے بچے اپنے والدین سے زیادہ بہتر معیارِ زندگی کے حامل ہو گئے۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ موجودہ معاشی بحران کسی حادثے کی وجہ سے سامنے آیا ہے تو یہ اُس کی خوش فہمی ہے۔ حقیقت میں تو یہ سب کچھ ایسی منصوبہ بندی سے کیا گیا تھا کہ حادثاتی ہی محسوس ہو۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ معاشی بحران کے تمام فائدے بھی مقتدر طبقے کو مل گئے جبکہ تمام تر نقصانات عوام کے حصے میں آئے۔ اب تازہ ترین صورت حال میں بھی ایسا ہی ہے۔ امریکی

ٹیرف میں اضافے کی وجہ سے پاکستان کی سٹاک مارکیٹ میں تاریخی مندی دیکھنے میں آئی جس کی وجہ سے اسے عارضی طور پر بند بھی کرنا پڑا‘ مگر وقفے کے بعد صورت حال مزید خراب ہوگئی۔ اِس طرح سرمایہ کاروں کا کھربوں ڈالرز کا نقصان ہوگیا۔ ہم کوئی معیشت دان تو نہیں ہیں مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ؎

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا‘ ناپائیدار ہوگا!

آج مسلمانوں کی بڑی بدنصیبی یہی ہے کہ اُنہیں کسی بھی مضبوط شاخ پر ٹھکانا بنانے کی نہ تو عالمی استعمار نے اجازت دی اور نہ وہ خود اسلام کے عادلانہ معاشی نظام کو قائم و نافذ کرنے کی کوشش کرتے نظر آئے۔ مملکتِ خداداد پاکستان ہی کو لے لیجیے۔ کئی دہائیوں سے آئی ایم ایف اور دیگر اداروں نے اِسے سودی قرضہ کے ذریعے معاشی بلکہ سیاسی‘ اخلاقی اور معاشرتی سطح پر بھی جکڑ رکھا ہے۔ ایسے میں صرف پاکستان ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ماضی میں اپنے ساتھ کی گئی زیادتیوں اور اپنی نااہلی اور بدعنوانی سے سبق سیکھتے ہوئے آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کریں۔ اسرائیل اور اُس کے معاون ممالک کی مصنوعات کا اگر تمام مسلم ممالک سرکاری سطح پر مل کر بائیکاٹ کریں اور صرف اپنے ملک میں بنی اشیاء کو استعمال میں لائیں تو دہرا فائدہ ہوگا۔ نہ صرف صہیونیوں کو گہرا زخم لگے گا بلکہ ملک کی اپنی صنعت اور اُس سے وابستہ مزدوروں کو بھی فائدہ ہوگا۔ پھر یہ کہ ہماری معیشت بہتر ہوجائے گی جسے گزشتہ ۷۷ برس میں بڑی محنت سے بگاڑا گیا ہے۔ ❁❁❁

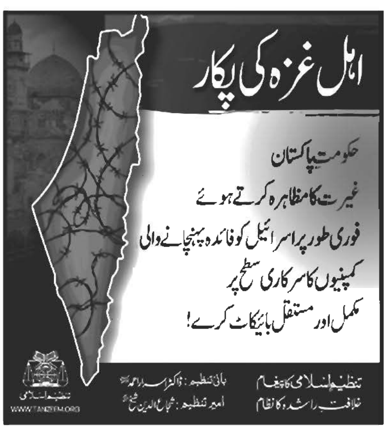

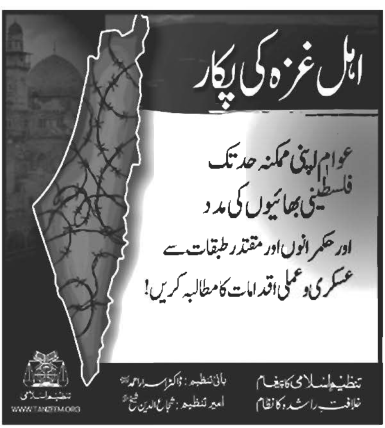

اہلِ غزہ کی پکار اور ہمارا کردار

شجاع الدین شیخ، امیر تنظیم اسلامی پاکستان

اسلام آباد میں منعقدہ قومی کانفرنس میں خطاب

(۱۰/اپریل ۲۰۲۵ء بمطابق ۱۱ شوال ۱۴۴۶ھ)

قابلِ صد احترام قائدینِ ملّت و عمائدینِ اُمّت!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝۷۵﴾ (النساء)

’’فلسطین اور اُمّتِ مُسلمہ کی ذمہ داری‘‘ جیسے موضوع پر غور وفکر کرنے اور کوئی اجتماعی لائحۂ عمل طے کرنے کے لیے آج ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انتہائی دقیق، تفصیل طلب اور کثیر الجہتی موضوع ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توفیق سے اس اہم ترین معاملے پر چند باتیں انتہائی مختصر انداز میں آپ کی خدمت میں پیش کرنا مقصود ہے۔

ناجائز صہیونی ریاست اسرائیل کی ۷۷ سالہ تاریخ فلسطینی مسلمانوں کے قتلِ عام، نسل کشی اور درندگی و بہیمیت سے لت پت ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک اس خطہ کی اہمیت کیا ہے، یہ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے، لہٰذا اس کی وضاحت کی احتیاج نہیں ہے۔

اسرائیل کے اہداف

یہود جو فلسطین پر ناجائز قبضہ جما کر بیٹھے ہوئے ہیں، آخر وہ کیوں غزہ میں قتل و غارت کر رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اُن کا ہدف صرف غزہ ہی نہیں بلکہ لبنان، شام، عراق، اردن، مصر کا ڈیلٹا اور مدینہ تک سعودی عرب کا شمالی حصہ بھی ان کا ہدف ہے۔ وہ اس پورے علاقہ میں گریٹر اسرائیل قائم کرنا چاہتے ہیں، جیسا کہ نیتن یاہو نے ایک حالیہ بیان میں کہا ہے کہ ان کے

پیشِ نظر پورے مشرقِ وسطیٰ کے نقشہ کو تبدیل کرنا ہے۔

آپ کے علم میں ہے کہ یہود تحریف شدہ ''تورات'' اور ''تالمود'' کی تعلیمات کی بنیاد پر اپنے ''مسایاح'' کا انتظار کر رہے ہیں' جو اصل میں حضور اکرم ﷺ کی حدیث کے مطابق دجّال ہوگا۔ گویا یہود کے نزدیک مسایاح (جو درحقیقت دجال ہوگا) نے ابھی آنا ہے۔ اس دجّال کی عالمی حکومت قائم کرانے کے لیے یہود کا ایجنڈا درج ذیل ہے:

۱) اَلْمَلْحَمَۃُ الْعُظْمٰی (Armageddon) یعنی ایک بڑی جنگ برپا کرنا۔

۲) اس کے نتیجہ میں گریٹر اسرائیل کا قیام۔

۳) مسجد اقصیٰ اور قُبَّۃ الصَّخْرہ (گنبدِ سنگ۔ The Dome of Rock) کو منہدم کر کے ان کی جگہ Third Temple تعمیر کرنا۔

۴) اس تھرڈ ٹیمپل میں تختِ داؤدی لا کر رکھنا اور اس پر دجّال کی تاج پوشی کرنا۔

اسرائیل اور پاکستان

اسرائیل' گریٹر اسرائیل کے قیام میں اپنے راستے کی رکاوٹ صرف پاکستان کو سمجھتا ہے جیسا کہ بن گوریان ۱۹۶۷ء میں پیرس میں ایک تقریب میں اس بات کا اظہار بھی کر چکا ہے۔

اس وقت تمام عرب ممالک اس کے زیرِ نگیں آ چکے ہیں' کچھ کو امریکہ اور اسرائیل مل کر تباہ کر چکے' باقی رہے سہے ایک ایک کر کے طوعاً وکرہاً اس کے ساتھ تعلقات بڑھا رہے ہیں۔ کچھ سفارتی سطح پر اسے تسلیم کر چکے ہیں اور کچھ تسلیم کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ ان کو بخوبی معلوم ہے کہ ایٹمی صلاحیت رکھنے والا پاکستان (جو قائم ہی اسلام کے نام پر ہوا ہے) اور خراسان سے کالے جھنڈوں والے لشکر نکلیں گے جو امام مہدیؑ کے ساتھ مل کر صہیونی ریاست کا قلع قمع کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ بقولِ اقبال: ؎

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے' میرا وطن وہی ہے!

موجودہ صورتِ حال میں اہلِ پاکستان کا کردار

فلسطین کی موجودہ ہنگامی صورتِ حال کے پیشِ نظر اسرائیل کے معاشی بائیکاٹ اور اس

کے خلاف عملی و عسکری اقدامات کے لیے بھرپور کوششوں کی ضرورت ہے۔ سب سے اہم کام یہ ہے کہ اکابرینِ دین اور عمائدینِ ملّت ون پوائنٹ ایجنڈا ’’غزہ بچاؤ‘‘ کے لیے باہم مل کر ایک متفقہ فورم بنائیں اور مل کر جِدّ و جُہد کریں۔

اس کے علاوہ فلسطین کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر ہماری نگاہ میں درج ذیل اقدامات ملکی اور اُمّت کی سطح پر مفید ہوں گے' ان شاء اللہ تعالیٰ:

۱) پاکستان کی تمام مساجد میں نمازوں میں دعاؤں خصوصاً قنوتِ نازلہ کا اہتمام کیا جائے' اور اللہ تعالیٰ سے یہودی فتنہ کے خاتمہ کے لیے خاص طور پر دعا کی جائے۔

۲) اسرائیل کے ناپاک عزائم' اُمّتِ مُسلمہ کا مستقبل اور اس پس منظر میں خاص طور پر پاکستان کو درپیش خطرات سے عمومی آگاہی خطاباتِ جمعہ' مختلف اجتماعات اور خصوصی طور پر سوشل میڈیا کے پلیٹ فارمز پر دی جائے۔

۳) تمام مکاتبِ فکر کے علماء کی جانب سے جہاد کا ایک متفقہ فتویٰ جاری ہونا چاہیے اور عالمی سطح پر بھی اس نوع کا فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یعنی اسرائیل کے خلاف عسکری و معاشی (جانی و مالی) جہاد حکومتی سطح پر نیز فرداً فرداً ہر مسلمان پر حسبِ استطاعت فرض ہے۔

۴) اکابرین اور عمائدینِ ملّت کا ایک وفد صدرِ پاکستان' وزیر اعظم' آرمی چیف' چیئرمین سینیٹ اور قومی و صوبائی اسمبلیوں کے اسپیکرز سے ملاقات کر کے ان کے سامنے اپنا موقف رکھے کہ پاکستان کو غزہ کے معاملے پر ایک سخت اور واضح موقف اختیار کرنا چاہیے۔ نیز حکومتِ پاکستان دوسرے ممالک کی حکومتوں اور مقتدر طبقات سے رابطہ کر کے اس بات کو آگے بڑھائے۔ اس ضمن میں مسلمانوں کے دینی مرکز مکّہ مکرمہ میں اجلاس/ کانفرنس بلا کر متفقہ طور پر لائحہ عمل طے کیا جائے تو' ان شاء اللہ' اس کے زیادہ بہتر اثرات ہوں گے۔

۵) حکومتِ پاکستان پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اسرائیلی سہولت کار کمپنیوں کی مصنوعات کا معاشی بائیکاٹ کرے۔ ان مصنوعات کی درآمد بند کی جائے اور اسرائیل نواز کمپنیوں کے کاروبار بند اور ان کے کاروباری لائسنس منسوخ کیے جائیں۔ بلاشبہ معاشی بائیکاٹ نے ان کمپنیوں کو متاثر کیا ہے اور وہ اس کا توڑ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں' لہٰذا اس کام کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

۶) اکابرین اور عمائدینِ ملّت کا نمائندہ وفد مسلمان ممالک کے سفراء سے ملاقات کرے اور ان کے سامنے درج ذیل نکات رکھے جائیں:

i) اسلامی برادری کے رشتہ کی بنیاد پر مظلوم مسلمانوں کی داد رسی کے لیے عملی اقدامات ہماری دینی ذمہ داری ہے۔

ii) تمام مسلم ممالک UNO کا دوہرا اور منافقانہ معیار اُجاگر کریں جس نے اپنے آپ کو امریکہ کی کنیز ثابت کر دیا ہے اور اس سے علیحدگی اختیار کرنے کا اعلان کریں۔

iii) اس ضمن میں ہمیں OIC کو فعال کرنے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں ۳۴ ممالک کی مشترکہ فوج جس کے سربراہ ہمارے سابقہ آرمی چیف ہیں‘ اس کو بھی OIC کے تحت فعال کیا جائے‘ کیونکہ مسلمانانِ فلسطین کی مدد اور مسجد اقصیٰ کی حفاظت کے لیے عسکری اقدامات بھی OIC کے چارٹر کا حصّہ ہے۔

iv) مسلم ممالک کو ایک مشترکہ اقتصادی‘ دفاعی اور اقدامی معاہدہ کرنا چاہیے جس میں پاکستان کلیدی کردار ادا کرسکتا ہے۔ مسلم ممالک اندرونی طور پر کافی حد تک خود کفیل ہیں‘ اگر وہ باہم تعاون کریں تو مغربی استعمار اور اس کی معاشی جکڑ بندی کا بآسانی مقابلہ کر سکتے ہیں۔

v) یہی اقدامات اسرائیل اور مغربی استعماری قوتوں کو مسلمانوں کا استحصال کرنے سے روک سکیں گے۔

۷) علماء کرام اور دینی تنظیم ’’اسرائیلی عزائم اور اُمّتِ مُسلمہ کا مستقبل‘‘ اور ’’اسرائیل کے قیام کی تاریخ‘‘ کے متعلق نوجوانوں اور بچوں کو آگاہی دینے کا اہتمام کریں۔

۸) طلبہ میں جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت پیدا کرنے کے لیے تعلیمی اداروں کے مالکان اور سربراہان کو راغب کیا جائے۔

۹) ایسی کمپنیوں کی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا جائے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اسرائیل کی مدد کرتی ہیں‘ اور جو دکاندار ایسی اشیاء رکھتے ہوں ان سے خریداری سے اجتناب کیا جائے اور دینی غیرت کے تقاضے کی طرف ان کی توجّہ دلائی جائے۔

۱۰) پاکستانی سرمایہ کاروں کو راغب کیا جائے کہ وہ ایسی مصنوعات کے متبادل مارکیٹ میں

لانے کے لیے سرمایہ کاری کریں۔

۱۱) عوام الناس سے غزہ کے مسلمانوں اور تحریک مزاحمت کے لیے مالی امداد کی اپیل کی جائے۔

۱۲) فلسطین کے مسلمانوں پر بے انتہا ظلم وستم کے خلاف ہمیں اجتماعی سطح پر بڑے پیمانے پر مظاہرے کرنے چاہئیں تاکہ پوری دنیا کو معلوم ہو سکے کہ مسلمان متحد ہیں اور ایک دوسرے کے درد کو محسوس کرتے ہیں۔ نیز یہ مسلمانانِ فلسطین کی بھی دل جوئی اور ہمت بڑھانے کا باعث ہوگا۔

۱۳) اللہ کے دین کے غلبے کے لیے جدّوجُہد جاری رکھی جائے۔ پاکستان نہ صرف عطیۂ خداوندی ہے بلکہ بقول ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسرائیل کے توڑ ہی کے لیے وجود میں آیا ہے۔ دونوں ممالک نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں اور شاید اسی لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں ایٹمی صلاحیت سے بھی نوازا ہے۔ تاہم ہنود و یہود کے خلاف بھی ہم تبھی ڈٹ کر کھڑے ہو سکتے ہیں جبکہ ایک طرف تو ہم سب آپس میں متحد و متفق ہوں‘ ملک میں بھائی چارہ کی فضا قائم ہو‘ آپس کی نفرتیں ختم ہوں اور دوسری طرف نظریۂ پاکستان ’’ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے‘‘ کو عملی تعبیر دے کر اسلام کو نافذ و غالب کرنے کی جِدّوجُہد کریں۔ گزشتہ ۷۷ سال سے ہم نے اس سے جو غفلت برتی اور نفرتوں کے بیج بوئے‘ ان پر صدقِ دل سے انفرادی واجتماعی توبہ کریں اور اللہ کی طرف واپس پلٹیں۔ جس طرح عالَمِ کفر مسلمانوں کے مقابلے میں ’’اَلکُفر مِلَّۃٌ وَاحِدَۃ‘‘ بنا ہوا ہے‘ اسی طرح ہمیں بھی ’’اَلْمُؤْمِنَ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُہٗ بَعْضًا‘‘ کے مصداق جسدِ واحد بن کر اور مل جل کر دشمنوں کی سازشوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ تاہم ہماری اور عالَمِ اسلام کی کامیابی دین کے غلبہ کے لیے جِدّوجُہد کے ساتھ مشروط ہے‘ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ ۝﴾ (محمد) ’’اے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور وہ تمہارے قدموں کو جما دے گا۔‘‘ اللہ کی مدد یہی ہے کہ ہم اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جِدّوجہد میں اپنا تن‘ من‘ دھن لگا دیں‘ تبھی ہم دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکیں گے۔

دینِ اسلام غالب ہو کر رہے گا' ان شاء اللہ!

بہرحال قیامت سے قبل اللہ تعالیٰ کا دین کُل روئے زمین پر غالب ہو کر رہے گا اور ہنود و یہود اور مشرکین سب مغلوب اور ذلیل وخوار ہو کر رہیں گے' ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۳۳﴾ (التوبۃ)

''وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر' خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔''

اور جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بشارت عطا فرمائی ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ زَوَى لِي الْأَرْضَ، فَرَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا، وَإِنَّ أُمَّتِي سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِي مِنْهَا))(سنن الترمذی)

''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے ساری زمین کو سمیٹ دیا' چنانچہ میں نے اس کے مشارق و مغارب کو دیکھ لیا' اور میری اُمّت کی حکومت وہاں تک پہنچ کر رہے گی جہاں تک کا علاقہ مجھے سمیٹ کر دکھایا گیا ہے۔''

((لَا يَبْقَى عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ كلمة الاسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيزٍ أَوْ بِذُلِّ ذَلِيلٍ، إِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ أَهْلِهَا أَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِينُونَ لَهَا)) (رواہ احمد)

''اللہ تعالیٰ روئے زمین کے ہر شہر اور بستی کے ہر گھر میں کلمہ اسلام داخل فرما دے گا' خواہ اسے کوئی عزّت کے ساتھ قبول کر لے یا ذلت کے ساتھ زندہ رہے۔ وہ لوگ جنہیں اللہ عزّت عطا فرمائے گا تو وہ ان کو اس کا اہل (محافظ) بنا دے گا یا ان کو ذلیل کر دے گا تو وہ اس کی اطاعت اختیار کر لیں گے۔''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ہدایت پر استقامت عطا فرمائے اور صحیح معنوں میں ہم قبلہ اوّل فلسطین اور اہلِ فلسطین کے لیے کچھ عملی اقدامات کر سکیں۔

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رَسولہِ الکریم
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ○ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ○ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ○﴾ (آمین)

خطبہ مسنونہ کے بعد:

آج ہم اللہ کا نام لے کر ''اُمّ القرآن'' یعنی سورۃ الفاتحہ پر غور وفکر شروع کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں پہلے تو مَیں یہ چاہوں گا کہ ہمارے ''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' میں یہ سورۂ مبارکہ جس مقام پر ہے اور اس میں مضمون کا جو ربط و تعلق ہے اس کو سمجھ لیا جائے۔

''منتخب نصاب'' میں سورۃ الفاتحہ کا مقام

''منتخب نصاب'' کے کُل چھ حصے ہیں۔ پہلے حصے میں چار جامع اسباق ہیں‘ جن میں سب سے پہلا سبق جو اس پورے منتخب نصاب کے لیے بمنزلہ اساس و بنیاد ہے وہ سورۃ ''العصر'' ہے‘ جس میں انسان کی نجات کی چار شرائط ہمارے سامنے آئی ہیں:

﴿وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾﴾

(۱) ایمان‘ (۲) اچھے عمل‘ (۳) حق و صداقت کی تبلیغ و اشاعت اور اس کا اعلان‘ (۴) (نتیجتاً ملنے والی تکالیف پر) صبر کی تلقین۔ یہ چار چیزیں لوازمِ نجات اور انسان کی کامیابی کی شرائط ہیں۔

دوسرا سبق ’’آیۃ البِرّ‘‘ پر مشتمل ہے‘ اُس میں بھی جامعیت کے ساتھ یہ چاروں چیزیں سامنے آئی ہیں۔

تیسرا سبق سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل ہے اور اس میں بھی نہایت جامعیت کے ساتھ یہ چاروں چیزیں سامنے آئی ہیں‘ لیکن وہاں ایک نہایت عظیم آیت آئی ہے: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝۱۳﴾ (لقمان) یعنی سب سے بڑی ناانصافی‘ سب سے بڑا ظلم‘ سب سے بڑی دھاندلی ’’شرک‘‘ ہے۔ ہمارے دین میں سب سے بڑا گناہ اور ناقابلِ معافی جرم شرک ہے۔ اسلام دینِ توحید ہے اور شرک توحید کی ضد ہے‘ لہٰذا اس اہمیت کے پیشِ نظر سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کے ضمن ہی میں ’’حقیقت و اقسامِ شرک‘‘ کے عنوان سے چھ تقاریر کی گئیں۔

’’منتخب نصاب‘‘ کے جامع اسباق میں سے چوتھا سبق سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ پر مشتمل ہے‘ لیکن اس کو میں عام طور پر اس منتخب نصاب کے دوسرے حصے جو ایمان کے مباحث پر محیط ہے‘ اس کے آخر میں رکھتا ہوں۔ ورنہ بحث بہت پھیل جائے گی اور جب گفتگو پھیل جائے تو پھر اُسے ایک نکتہ کی طرف لانے کے لیے ایک جامع سبق کی ضرورت ہے جو اگرچہ اصلاً پہلے حصے سے متعلق ہے لیکن درس میں ہم اسے دوسرے حصے کے آخر میں رکھتے ہیں۔ سورۃ العصر میں مذکور چار شرائطِ نجات میں سے پہلی شرط ایمان ہے‘ اور اس سلسلے میں کچھ تفصیلی مباحث ’’منتخب نصاب‘‘ کے دوسرے حصے میں مذکور ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلا مقام سورۃ الفاتحہ ہے‘ جس پر آج ہم غور و فکر شروع کر رہے ہیں۔

حکمت: سلامتیٔ فطرت و سلامتیٔ عقل کا مجموعہ

اب ذرا معنوی ربط سمجھ لیجیے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے مطالعے سے حضرت لقمان کی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے‘ اور مَیں یہ بات تفصیل سے عرض

کر چکا ہوں کہ نہ وہ نبی تھے اور نہ ہی کسی رسول یا نبی کے اُمّتی تھے‘ بلکہ وہ صرف ایک حکیم اور دانا انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِکۡمَۃَ﴾ (لقمٰن:۱۲) ’’اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت سے نوازا تھا!‘‘ حکمت کیا چیز ہے؟ یہ دو چیزوں کے امتزاج سے وجود میں آنے والی شے ہے: سلامتیٔ فطرت اور سلامتیٔ عقل۔ انسان کی فطرت مسخ نہ ہو بلکہ درست ہو‘ اپنی صحت وتندرستی پر برقرار ہو تو اسے ہم سلیم الفطرت انسان کہتے ہیں اور اُس کی عقل بھی صحیح طور پر کام کر رہی ہو تو وہ سلیم العقل انسان ہے۔ چنانچہ جس انسان میں یہ دونوں چیزیں (سلامتیٔ فطرت اور سلامتیٔ عقل) جمع ہو جائیں تو وہ حکیم کہلائے گا۔ لہٰذا جب وہ اپنی فطرت کی رہنمائی میں اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے غور وفکر کرے گا تو اس کائنات کے جو بعض بڑے اور بنیادی حقائق ہیں اُن کے قریب تر پہنچ جائے گا۔ مَیں نے بہت جان بوجھ کر محتاط لفظ ’’قریب تر‘‘ استعمال کیا ہے‘ اس لیے کہ ان حقائق تک کما حقہٗ پہنچ جانا تو ممکن نہیں ہے۔ وہ تو درحقیقت وحی کی راہنمائی ہی ہے جو انسان کو آخری منزل تک پہنچانے والی ہے‘ البتہ حکیم شخص قریب تر پہنچ سکتا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی قسمت میں پر حضور نہیں!

عقل انسان کو آستانے کے قریب تر ضرور پہنچا دیتی ہے لیکن حاضری اور حضوری عقل کی رسائی سے دور ہے۔ اسی لیے علامہ بیان کرتے ہیں: ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے‘ منزل نہیں ہے!

اس شعر میں کمال توازن ہے کہ عقل کو نور کہہ رہے ہیں لیکن اس کی بھی limitation ہے۔ اگرچہ یہ نور ہے لیکن یہ جان لو کہ اس کی رسائی کی بھی ایک حد ہے۔ علامہ نے یہ بات نہایت شان وشوکت کے ساتھ ایک فارسی شعر میں بیان کی ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری کا اصل حسن تو اُن کے فارسی کلام میں نکھر کر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ؎

بُوعلی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

عظیم دانشور بوعلی سینا ہمارے ہاں اُن فلاسفہ میں سے ہیں جن کو یہاں گویا کہ عقلیت کے ایک مجسمے کے طور پر بطور استعارہ لایا جا رہا ہے۔ علامہ کے نزدیک وہ بھی اس اونٹنی کے آس پاس تو پہنچ گئے ہیں جس پر محمل (کجاوہ) میں محبوب سوار ہے لیکن اُس اونٹنی کے چلنے سے جو گرد و غبار اُڑ رہا ہے وہ اُسی کے اندر گم ہو کر رہ گئے ہیں' جبکہ رومی کا ہاتھ محمل کے پردے کو جا کر تھام لیتا ہے۔

مَیں نے یہ باتیں اس لیے دُہرادی ہیں کہ حضرت لقمان کی شخصیت جن کا ذکر سورۂ لقمان میں آیا ہے' درحقیقت اُن کی حیثیت ایک علامت (symbol) کی سی ہے' جن کے حوالے سے قرآن یہ سمجھا رہا ہے کہ انسان بغیر وحی کے' اپنی عقل اور اپنی فطرت کی راہنمائی میں بھی بہت سا سفر طے کر سکتا ہے۔ اور وہ سفر کیا ہے؟

پہلی بات: کائنات کے خالق اور مالک کو پہچاننا اور اُس کی توحید سے آگاہ ہو جانا۔ یہ وہ منزل ہے کہ جس تک انسان اپنی عقل اور فطرت کی رہنمائی میں پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝۱۳ ﴾

''اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ شرک مت کرنا' یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

دوسری بات: انسان کے اعمال' نیکیاں اور بدیاں ضائع جانے والی نہیں ہیں۔ عقل اسے تسلیم نہیں کرتی۔ عام قاعدہ کلیہ ہے: ع ''گندم از گندم بروید جو ز جو'' گندم سے گندم پیدا ہوتی ہے اور جو سے جو اُگتے ہیں' لیکن دنیا میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ اُلٹا بھی نکلتا ہے۔ آپ کسی کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں اور وہ آپ کے ساتھ برائی کرتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بڑھ کر بھلائی کرنے والا کون ہوگا؟ اُن کے ساتھ جتنا بُرا سلوک ہوا ہے' اُس کا تصوّر کر لیجیے۔ صرف غیروں کے ہاتھوں نہیں اپنوں کے ہاتھوں سے بھی' جو بظاہر آپؐ کے نام کا کلمہ پڑھنے والے تھے۔ عبداللہ بن اُبی کون تھا؟ اُس نے اُمّ المؤمنین

حضرت عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت دھری‘ جس کا صدمہ جس قدر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہوا وہ آپؐ کے بعض فرمودات سے واضح ہوتا ہے۔ جو الفاظِ مبارکہ آپؐ کی زبان سے ادا ہوئے ہیں اُن سے شدّتِ صدمہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ کیا کوئی شخص ایسا نہیں رہا جو اس شخص کی ایذا رسانی سے مجھے بچا سکے! ذرا اندازہ کیجیے کہ اس جملے کے اندر کس قدر درد اور رنج و غم ہے! یہ اُس کی طرف سے پہنچ رہا ہے جو بظاہر کلمہ گو ہے۔ معلوم ہوا کہ اس دنیا میں ’’گندم از گندم بروید جوز جو‘‘ والا معاملہ شاید ہی کبھی ہوتا ہو اور وہ بھی اُس نسبت اور تناسب سے نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایک اور عالم درکار ہے‘ ایک اور زندگی ہونی چاہیے جس میں تمام اعمال کے حسبِ حقیقت نتیجے نکلیں۔ یہ بھی فطرت اور عقل کے مطابق معاملہ ہے‘ یہاں تک بھی عقل کے ذریعے رسائی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا حضرت لقمان کی دوسری نصیحت یہ تھی:

﴿یٰبُنَیَّ اِنَّهَآ اِنۡ تَكُ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ فَتَكُنۡ فِیۡ صَخۡرَةٍ اَوۡ فِی السَّمٰوٰتِ اَوۡ فِی الۡاَرۡضِ یَاۡتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ ۝۱۶﴾

’’اے میرے بیٹے! (اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے‘ پلّے باندھ لے کہ انسانی اعمال‘ خواہ وہ نیکیاں ہوں یا بدیاں‘ پھر) خواہ وہ رائی کے دانے کے برابر ہم وزن ہوں‘ پھر خواہ وہ کسی چٹان کے اندر ہوں‘ خواہ آسمانوں میں ہوں یا زمین میں‘ اللہ ان سب کو لے آئے گا۔ یقیناً اللہ لطیف اور خبیر ہے۔‘‘

معلوم ہوا کہ ایمانیاتِ ثلاثہ میں سے توحید اور آخرت تک تو انسان کی رسائی ہو سکتی ہے۔ تیسری چیز جو انسان اپنی عقل اور فطرت کی روشنی میں پہچان سکتا ہے وہ نیکی اور بدی‘ خیر اور شر‘ بھلائی اور برائی میں فرق ہے۔ جو بنیادی اسلامی اخلاقیات ہیں ان کے لیے انسان وحی کا محتاج نہیں ہے۔ فطرتِ انسانی یہ جانتی ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا بُرا ہے‘ اس بات کو سمجھنے کے لیے کسی وحی کی ضرورت نہیں ہے جو حقیقت کو روشن کرے۔ انسان فطرتاً اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ وعدہ پورا کرنا اچھائی ہے اور وعدہ خلافی کرنا بُرائی ہے‘ یہ بات ذہن میں بٹھانے کے لیے کسی وحی کی ضرورت نہیں۔

رسالت ونبوت اور وحی کی ضرورت

ان حقائق کو سمجھنے کے بعد اب ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اپنے سامنے لے آیئے کہ: پھر رسالت و نبوت اور وحی کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ضرورت دو اعتبار سے سامنے آتی ہے۔پہلی بات یہ کہ ایمان کا جو خاکہ ہمیں عقل اور فطرت سے ملتا ہے اس میں گہرائی اور گیرائی وحی سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک اجمالی علم ہے‘ ایک ابتدائی خاکہ ہے جو آپ نے بنا لیا ہے‘ اب اُس کے اندر تفصیلات اور یقین کی گہرائی کا پیدا ہونا ضروری ہے‘ یہ مقصد بغیر وحی کے ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو آپ نے مان لیا اور جان لیا لیکن اللہ تعالیٰ کے اَسماء وصفات کا علم بغیر وحی کے نہیں ہوسکتا‘ یہ کہ وہ ''عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' ہے‘ وہ ''بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ'' ہے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا کہ ''ایمانِ مجمل'' میں صرف اللہ کو مان لینا ایمان نہیں ہے جب تک کہ اُس کے ساتھ اَسماء وصفاتِ باری تعالیٰ کا علم شامل نہ کیا جائے۔

آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ

''میں اللہ پر ایمان لایا جیسا کہ وہ اپنے اَسماء وصفات کے ساتھ ہے اور میں نے اس کے تمام احکام کو قبول کیا‘ زبان سے اقرار اور دل کی تصدیق کے ساتھ۔''

مَیں نے اس کے لیے دو الفاظ استعمال کیے ہیں: گہرائی اور گیرائی‘ یعنی اس کے اندر وسعت اور پختگی ہو۔ یہ دونوں علم نبوت اور علم وحی سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ عقل اور فطرت کے ذریعے اجمالی علم یا بنیادی تصور حاصل ہوسکتا ہے لیکن مقامِ حضوری وحی کی رہنمائی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک ''ایمان بالآخرت'' کا معاملہ ہے وہ اور بھی زیادہ ضروری ہے‘ اس پہلو سے کہ مجرد یہ جان لینا کہ ایک اور ''عالَم ہونا چاہیے'' کہ جس میں جزاوسزا ہو‘ یہ انسان کے عملی رویے کو درست رکھنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ جب تک کہ انسان میں ''ہونا چاہیے'' کی بجائے ''یہ معاملہ امرِ واقعہ میں ہے'' کا رنگ پیدا نہ ہو۔ ایسا عالَم ہونا چاہیے ایک تصور وخیال ہے جبکہ ایسا فی الواقع موجود ہے ایک یقینی خبر ہے‘ اور یہ تب ممکن ہے

جب کوئی پختہ یقین کے ساتھ یہ خبر دینے والا ہو۔ یہ خبر دینے والا کون ہوگا؟ ع ’’پیمبر ہرچہ گوید دیدہ گوید!‘‘ جس کو جنّت کا پیشگی کھلی آنکھوں مشاہدہ کرادیا گیا ہو‘ جس کو دوزخ کا پیشگی مشاہدہ کرادیا گیا ہو تو وہ اس یقین کے ساتھ گواہی دے کہ مَیں تمہیں خبر دے رہا ہوں کہ یہ سب کچھ موجود ہے۔ ایک حکیم اور دانا انسان ’’ہونا چاہیے‘‘ کی حد تک تو پہنچ جائے گا لیکن وحی نبوت اور وحی رسالت کے ذریعہ اس میں یقین کی گہرائی پیدا ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو ایمان بالآخرت کی تفاصیل ہیں: بعث بعد الموت‘ حشر ونشر‘ جزا وسزا‘ وزنِ اعمال‘ جنت اور دوزخ‘ جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی عقوبتوں کی تفصیلات‘ ظاہر بات ہے کہ یہ سب عقلِ انسانی کی گرفت سے باہر ہے۔ یہ سب کچھ تو وحی ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوگا‘ اور وحی ہی کے ذریعہ سے اس خاکہ میں تفصیلی رنگ بھرا جائے گا۔ وہی بات جو مَیں نے پہلے عرض کی کہ اس میں گہرائی اور گیرائی دونوں چیزیں درحقیقت وحی ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ یہ تو معاملہ ہوا ایمان بالآخرت کا۔

انسانی تمدن کے تین عقدہ ہائے لاینحل

اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ انسانی زندگی میں جو اُس کا عملی رُخ ہے‘ اُس میں اخلاقیات سے متعلق موٹی موٹی باتیں‘ مثلاً جھوٹ اور سچ‘ وعدہ اور ایفائے عہد وغیرہ تو انسانی فطرت میں شامل ہے‘ لیکن انسانی تمدن کے جو پیچیدہ مسائل ہیں‘ ان کا حل عقل انسانی ہرگز نہیں کرسکتی۔ ان کے حل کے لیے وہ وحی آسمانی کی سراپا محتاج ہے‘ اس لیے کہ انسان حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک مرد غور وفکر کرنے کے بعد بھی عورت کے احساسات کو نہیں جان سکتا۔ وہ اگر کسی عائلی عقدے کا حل کرے گا تو ایک مرد کے اعتبار سے کرے گا‘ مرد ہونے کے رُخ سے کرے گا‘ وہ عورت کے ساتھ انصاف نہیں کرپائے گا۔ اگر عورت سوچے گی تو وہ اپنے احساسات کو مقدم رکھے گی‘ تمدن کی دوسری مصلحتیں اُس کے پیش نظر نہیں رہ سکیں گی۔ مرد جب غور کرے گا تو وہ اپنے انفرادی حقوق کی طرف زیادہ زور دے گا جبکہ اجتماعی مصلحتوں سے اُس کی توجہ ہٹ جائے گی۔ کوئی اصحابِ حکومت ہوں گے تو وہ اجتماعی مصلحتوں کا زیادہ رونا روئیں گے‘ ان کی نگاہ میں افراد

کے حقوق کی اتنی اہمیت نہ رہے گی۔ مزدور ہوگا تو اُس کے سامنے اپنا مسئلہ تو ہوگا لیکن وہ سرمایہ دار یا کارخانہ دار کے نقطۂ نگاہ سے غور نہیں کر سکتا‘ جبکہ کارخانہ دار یا سرمایہ دار اپنی اُلجھنوں کو تو خوب سمجھتا ہے‘ اُن کے حل کے لیے تو بے تاب ہوگا لیکن مزدور کی جگہ کھڑے ہو کر نہیں سوچ سکتا کہ اُس کے احساسات کیا ہیں! یہ جو انسانی تمدن کی پیچیدگیاں ہیں‘ ان کو سلجھانے کے لیے وحی کی راہنمائی ضروری ہے۔

مَیں نے سادہ الفاظ میں دراصل تین اہم حقیقتیں آپ کے سامنے رکھی ہیں‘ جو عقدہ ہائے لاینحل ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ مرد اور عورت میں حقوق اور ذِمہ داریوں کا توازن کیا ہوگا؟ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عورت کو بھیڑ بکری کی طرح ملکیت بنالیا جاتا ہے‘ مرد اُس پر حکومت کرتا ہے‘ حکم چلاتا ہے‘ اُس کا آقا بن جاتا ہے‘ وہ اُس کی باندی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے مرد کے پاؤں کی جوتی قرار دیا جاتا ہے۔ یا یہ انتہا ہوگی اور یا دوسری انتہا ہوگی کہ کوئی عورت قلوپطرہ بن کر کسی ملک کی قسمت کا بیڑا غرق کر دے گی۔ چنانچہ یہ دو انتہائیں ہیں۔ یا وہ عورت شمع محفل بن جائے یا اُس کا استحصال کیا جارہا ہو‘ اُس کے نسوانی اعضاء کی تشہیر کی جارہی ہو اور اس طرح عورت کو بکاؤ مال بنا دیا گیا ہو۔ ان دو انتہاؤں میں توازن کیا ہے؟ یہ بہت ہی کٹھن سوال ہے‘ جس کا حل عقل انسانی کے بس کا روگ نہیں۔

اسی طرح ایک مسئلہ ہے فرد اور جماعت کے حقوق و فرائض طے کرنے کا۔ فرد کے حقوق زیادہ ہیں یا اجتماعیت کے حقوق زیادہ ہیں؟ دُنیا میں اس وقت دو نظام رائج ہیں۔ ڈیموکریٹک نظام میں زیادہ زور افراد کے حقوق پر دیا جاتا ہے۔ یا پھر مطلق العنان (totalitarian) نظام ہوگا‘ کوئی مستبد آمرانہ نظام‘ کوئی فاشسٹ regime‘ جو افراد کے حقوق کو کچل دے گی اور معاشرہ واجتماعیت کے حقوق کا زیادہ پرچار کرے گی۔ یہی عدم توازن دنیا میں چلا آرہا ہے۔

یہی معاملہ معاشی مسائل کا بھی ہے جنہوں نے خاص طور پر صنعتی انقلاب کے بعد ایک گمبھیر اور لاینحل عقدے کی صورت اختیار کرلی ہے‘ یعنی یہ کہ سرمایہ اور محنت کے مابین صحیح توازن کیسے قائم کیا جائے۔ جب تک مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی یہ بڑا سادہ مسئلہ تھا لیکن

مشین نے انسان کی قوتِ کار کو ہزار گنا بڑھا دیا ہے۔ مشین سرمائے سے خریدی جاتی ہے' محنت کی حیثیت گھٹ گئی ہے' سرمائے کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ محنت (labour) اور سرمائے (capital) کے درمیان توازن کیسے قائم کیا جائے اور اقتصادی معاملات میں عدل و اعتدال کے تقاضے کیسے پورے کیے جائیں!

سورۃ الفاتحہ: رواں ترجمہ

یہ تین مسئلے انسانی تمدن کے پیچیدہ ترین مسائل ہیں جن کو حل کرنا عقل انسانی کے بس کا روگ نہیں' یہاں انسان بالکل محتاج ہے آسمانی ہدایت کا' اللہ کی دستگیری کا۔ چنانچہ وہ گھٹنے ٹیک کر درخواست کرے گا کہ اے رب! تو ہی بتا وہ صراطِ مستقیم کون سی ہے جس پر چل کر ہم اپنی سعادت اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکیں۔ یہ ہے مقام سورۃ الفاتحہ کا۔ اب اس کا ترجمہ دیکھیے:

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴾

''کُل شکر اور کُل ثنا (حمد) اللہ کی ہے جو تمام جہانوں کا مالک بھی ہے اور پروردگار بھی۔''

﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴾

''اُس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر جیسی بھی ہے اور مستقل' دائم اور پائیدار بھی۔''

﴿مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ﴾

''وہ جزا اور سزا کے دن کا مختارِ مطلق بھی ہے۔''

﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ﴾

''(اے ربّ!) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے۔''

﴿اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ﴾

''ہدایت بخش ہمیں سیدھے راستے کی۔''

﴿صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۙ﴾

’’راستہ اُن لوگوں کا جن پر تیرا انعام نازل ہوا۔‘‘

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾

’’جن پر نہ تو تیرا غضب نازل ہوا۔‘‘

﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ۧ﴾

’’اور نہ ہی وہ گمراہ ہوئے۔‘‘

سورۃ الفاتحہ اور سورۂ لقمان (رکوع ۲) میں ربط

اب ذرا غور کیجیے! جو شخص یہ الفاظ زبان سے نکال رہا ہے اُس کی پوزیشن معین ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو جانتا اور مانتا ہے۔ یہ بھی جانتا ہے کہ کُل حمد‘ کُل ثنا‘ کُل شکر اُسی کے لیے ہے۔ یہ جانتا ہے کہ وہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ یہ جانتا ہے کہ وہ رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ گویا کہ اُس کی توحید کامل ہے‘ توحید میں کہیں کوئی کمی نہیں۔ پھر وہ اجمالاً جانتا ہے کہ جزاو سزا ہوگی: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ؕ﴾۔ اس کا اقرار کر رہا ہے اور یہ بھی کہہ رہا ہے کہ جزاو سزا کا مطلق اختیار بھی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ اجمالاً ایمان بالآخرۃ ہے۔ اس کا جو نتیجہ نکلنا چاہیے کہ پھر اُسی کا ہو کر رہے‘ اُسی کی بندگی کرے۔ اپنے آپ کو اُسی کے حوالے کرے‘ اُسی کے سامنے جھک جائے‘ اس کا بھی وہ زبان سے اقرار کر رہا ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ؕ﴾۔

یہاں تک وہ پہنچا ہوا ہے۔ یہی مقام ہے حضرت لقمان کا‘ وہ یہیں تک پہنچے ہوئے تھے۔ ایک سلیم الفطرت انسان‘ ایک سلیم العقل انسان‘ اپنی اُس سلیم فطرت اور سلیم عقل کی راہنمائی میں جہاں تک پہنچ سکتا تھا‘ وہاں تک آ گیا ہے۔ اب آگے اُس کا مقامِ احتیاج آ گیا ہے‘ جہاں اُسے گھٹنے ٹیک کر درخواست پیش کرنی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ کہہ رہا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ۙ﴾ ’’اے میرے ربّ! مجھے سیدھا راستہ دکھا!‘‘ میری زندگی کی پر پیچ راہیں ہیں‘ اس میں قدم قدم پر چوراہے ہیں‘ سہ راہے ہیں‘ مَیں کہیں غلط موڑ نہ مڑ جاؤں۔ میں کسی مسئلہ میں عدم توازن کا شکار نہ ہو جاؤں‘ کسی عمل یا ردِّعمل کا شکار نہ بن جاؤں۔ تُو ہی ہدایت کے ذریعے میری دستگیری فرما۔ زندگی کی یہ پیچیدہ اور پُر پیچ راہیں

اور تمدن کے یہ پیچیدہ اور لاینحل عقدے اور مسئلے ہیں' ان میں تُو ہی دستگیری فرمائے گا تو مَیں سلامتی کے ساتھ گزر پاؤں گا۔ معلوم ہوا کہ یہ ہے وہ مقام کہ جہاں آ کر انسان ہدایتِ ربانی کا محتاج ہے۔

جان لیجیے کہ اسی درخواست کو قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ جاری فرمایا۔ فطرتِ انسانی کی ترجمانی یہاں کردی گئی ہے کہ انسان اپنی عقل و فطرت کی راہنمائی میں یہاں تک پہنچ سکتا ہے' یہاں سے آگے اُسے راہنمائی درکار ہے' اسی لیے ہم نے نبی بھیجے' وحی نازل کی' سلسلہ نبوت ورسالت جاری کیا' اسی لیے ہم نے کتابیں اُتاریں' ہم نے شریعت نازل فرمائی۔ چنانچہ یہیں سے آگے جواب شروع ہو جائے گا:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾

''الف' لام' میم۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں ادنیٰ بھی شک و شبہ نہیں۔ سچے طلب گاروں کے لیے ہدایت ہے۔''

یہ ہے وہ قرآن کریم جو سیدھا راستہ دکھانے والی کتاب ہے۔ جس شخص میں اُس صراطِ مستقیم کی طلب پیدا ہوگئی ہو جس کا اظہار سورۃ الفاتحہ کی شکل میں دعا کی صورت میں کیا گیا ہے' اُس کی درخواست کے جواب میں پورا قرآن مجید نازل کیا گیا ہے' بالخصوص سورۃ البقرۃ اور سورۃ النساء جن میں شریعت کی بہت سی تفصیلات جامعیت کے ساتھ آئی ہیں۔ اس طرح یہ دو ربط سامنے آ گئے۔ منتخب نصاب میں ایمان کے مباحث سورۃ الفاتحہ سے شروع ہو رہے ہیں اور اس کا ربط سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ساتھ ہے۔ حضرت لقمان کی شخصیت کو اگر ہم ایک علامتی (symbolic) حیثیت دیں کہ فطرتِ انسانی اور عقل انسانی انسان کو اس مقام تک لے آتی ہے جس کو قرآن نے حضرت لقمان کے حوالے سے واضح کیا تو اس مقام پر کھڑے ہو کر انسان کو جو مزید ضرورت ہے' انسان اپنے رب سے جو طلب کرے گا' اس کی اس طلب کو الفاظ کا جامہ پہنا کر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفاتحہ کی صورت میں نازل فرما دیا اور اس کو اپنی کتاب کے آغاز میں لگا کر بہت ہی حسین ربط پیدا کر دیا کہ گویا اس طلب کا جواب ہے قرآن مجید۔ فطرتِ انسانی کی پکار پر

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اجابت ہوئی ہے وہ ہے یہ کلام پاک‘ وہ ہے یہ صراطِ مستقیم‘ وہ ہے یہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کہ جس کو لے کر یہ قرآن مجید نازل ہوا۔

سورۃ الفاتحہ کے مختلف نام

اس ربط کو سمجھنے کے بعد اب مَیں یہ چاہوں گا کہ اس سورہ مبارکہ کے بارے میں چند بنیادی باتیں بیان کروں۔ سب سے پہلے ملاحظہ کیجیے سورۃ الفاتحہ کے نام۔ عربوں کا یہ مزاج اور ذوق ہے کہ انہیں جس شے سے زیادہ محبت ہوتی ہے اُس کے نام زیادہ رکھتے ہیں‘ اُس شے کا ہر وقت کے حساب سے ایک نام رکھ لیتے ہیں۔ گھوڑا عربوں کی بڑی قیمتی اور محبوب متاع ہے تو گھوڑے کے لیے سینکڑوں نام ہیں۔ تلوار عربوں کی بڑی قیمتی متاع تھی تو تلوار کے لیے بھی ہزاروں نام ملتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ الفاتحہ کے بہت سارے نام پائے جاتے ہیں۔ ’’الفاتحہ‘‘ اس کا سب سے زیادہ مشہور و معروف اور زبان زدِ خاص و عام نام ہے‘ جو ’’ف ت ح‘‘ مادّہ سے بنا ہے۔ ’’فَتَحَ يَفْتَحُ‘‘ کے معنی ہیں کسی چیز کو کھولنا۔ اسی سے لفظ ’’افتتاح‘‘ ہے‘ لہٰذا ’’الفاتحہ‘‘ کے معنی ہوئے ’’قرآن مجید کی افتتاحی سورت‘‘ (The Opening Surah of the Quran)۔ اس سے قرآن کریم کا افتتاح ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس سورت نام سورۃ الفاتحہ ہے۔ اس کا ایک نام ’’الکافیہ‘‘ (۱) یعنی کفایت کرنے والی ہے‘ اس لیے کہ فلسفہ قرآن کا لب لُباب اس میں موجود ہے۔ اس کا ایک نام ’’الشافیہ‘‘ (۲) یعنی شفا دینے والی ہے‘ کیونکہ قرآن مجید اپنے آپ کو شفا قرار دیتا ہے: ﴿وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ﴾ (یونس:۵۷) یعنی جو کچھ سینوں کے اندر روگ (بیماریاں) ہیں اُن کے لیے یہ شفا ہے۔ تو یہ سورت قرآن کے شفا ہونے کے لحاظ سے بھی اُس کا خلاصہ ہے‘ تو الشافیہ: شفا دینے والی۔ دیگر ناموں کی طرح ایک نام ’’الرقیۃ‘‘ (دم) بھی آیا ہے۔ (۳) اس کا ایک بہت اہم نام ہے اُمّ القرآن (۴): قرآن مجید کے لیے جڑ۔ اساس القرآن: قرآن مجید کے لیے بنیاد۔ اس کے لیے ’’اُمّ الکتاب‘‘ کا لفظ تو ایک حدیث میں بھی آیا ہے۔ ’’فاتحۃ الکتاب‘‘ کا لفظ بھی حدیث میں آیا ہے: ((لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) (۵) ’’اُس شخص کی کوئی نماز نہیں جس نے فاتحہ

الکتاب نہیں پڑھی۔ یہ اس کے بہت سے نام ہیں۔

رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی مکمل سورۃ

دوسری بات یہ جانیے کہ یہ سب سے پہلی مکمل سورت ہے جو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی۔ اس سے پہلے متفرق آیات نازل ہوئیں۔ سب سے پہلی وحی سورۃ العلق کی پانچ آیات ہیں:

﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ﴿۵﴾﴾

اس کے بعد —— اگرچہ یہ چیز بالکل متفق علیہ تو نہیں ہے‘ البتہ تقریباً جو اجماع سامنے آیا ہے وہ مَیں عرض کر رہا ہوں —— دوسری وحی سورۃ القلم یا سورہ نٓ کی پہلی سات آیات پر مشتمل ہے:

﴿نٓ وَ الۡقَلَمِ وَ مَا یَسۡطُرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ مَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ ۚ﴿۲﴾ وَ اِنَّ لَکَ لَاَجۡرًا غَیۡرَ مَمۡنُوۡنٍ ۚ﴿۳﴾ وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ﴿۴﴾ فَسَتُبۡصِرُ وَ یُبۡصِرُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ بِاَىيِّكُمُ الۡمَفۡتُوۡنُ ﴿۶﴾ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِهٖ ۪ وَ هُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِیۡنَ ﴿۷﴾﴾

پھر تیسری وحی سورۃ المزمل کی ابتدائی سات آیات ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الۡمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِیۡلًا ۙ﴿۳﴾ اَوۡ زِدۡ عَلَیۡهِ وَ رَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا ؕ﴿۴﴾ اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ﴿۵﴾ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیۡلِ هِیَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّ اَقۡوَمُ قِیۡلًا ؕ﴿۶﴾ اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا ؕ﴿۷﴾﴾

پھر چوتھی وحی سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیات ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۪ۙ﴿۳﴾ وَ ثِیَابَکَ فَطَهِّرۡ ۪ۙ﴿۴﴾ وَ الرُّجۡزَ فَاهۡجُرۡ ۪ۙ﴿۵﴾ وَ لَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَکۡثِرُ ۪ۙ﴿۶﴾ وَ لِرَبِّکَ فَاصۡبِرۡ ؕ﴿۷﴾﴾

پانچویں وحی یہ سورۃ الفاتحہ ہے۔ یہ بھی سات آیات پر مشتمل ہے اور یہ پہلی مکمل

سورت ہے۔اس سے پہلے جو آیات وحی کی صورت میں نازل ہوئی ہیں وہ ان سورتوں کی ابتدائی آیات ہیں۔سورۃ العلق کی پانچ‘سورۃ ن کی سات‘سورۃ المزمل کی سات‘ سورۃ المدثر کی سات اور پھر سورۃ الفاتحہ کی سات آیات ہیں۔دلچسپی کے لیے اور یاد رکھنے کے لیے یہ سہولت ہو جائے گی‘ پانچ سے شروع ہوئے تھے‘ پھر پانچ پر چلے جایئے۔چھٹی وحی سورۃ اللھب ہے:

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝﴾

یہ بھی پانچ آیات پر مشتمل ہے۔

عظیم ترین نعمتِ خداوندی

اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں تیسری بات جانیے کہ اس کی عظمت کو خود قرآن کریم نے ایک مقام پر نہایت شاندار طور پر بیان کیا ہے۔سورۃ الحجر میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا: اے نبی ﷺ! کافروں اور مشرکوں کو جو ہم نے بہت سی دولت‘ سرمایہ اور دنیاوی حیثیت دی ہوئی ہے آپؐ کا قلبِ مبارک اس سے قطعاً کوئی تاثر قبول نہ کرے‘ آپؐ کی نگاہ بھی ان کی طرف نہ اُٹھے۔

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ﴾ (آیت ۸۸)

’’آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اس مال و متاع کی طرف جو ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو دے رکھا ہے۔‘‘

آپؐ کی نگاہ میں ان کی وقعت پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں ہونی چاہیے‘ آپؐ کو تو ہم نے وہ دولت دی ہے کہ جس کی دنیا کی کوئی دوسری نعمت برابری کا تصور نہیں کر سکتی:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝﴾ (الحجر)

’’اور ہم نے آپ کو دی ہیں سات بار بار پڑھی جانے والی آیات اور عظمت والا قرآن۔‘‘

یہ سورۃ الفاتحہ کی سات آیات ہیں۔یہ جان لیجیے کہ یہ کسی کا اجتہادی قول نہیں ہے‘ بلکہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے' سورۃ الفاتحہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ الَّذِيْ اُوْتِيْتُهٗ))[٦]

''سورۃ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہی ''سبع مثانی'' اور ''قرآن عظیم'' ہے جو مجھے عطا ہوئی ہے۔''

اللہ ربّ العزت نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنی بڑی دولت دی ہے' اتنی بڑی نعمت دی ہے کہ کُل دنیا و مافیہا اور اُس کی تمام نعمتیں ان کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ لفظ ''مثانی'' ثنا سے بنا ہے' تثنیہ بھی اسی سے بنا ہے۔ ثنا کہتے ہیں کسی کے وصف کو اُس کی طرف لوٹانا۔ آپ نے کسی کے حسن کی تعریف کی' گویا آپ نے اُس کے وصف کو اُس کی طرف لوٹا دیا۔ کسی کو یوں کہیے کہ وہ بہت فراخ دل ہے' سخی ہے' اس میں سخاوت پائی جاتی ہے' آپ نے اُس کی سخاوت کی تعریف کی تو گویا آپ نے اُس کے وصف کو اُس کی طرف لوٹا دیا۔ اس کو ثنا کہتے ہیں۔ دراصل عربی زبان میں ثاء' نون اور یاء کا مادہ لوٹانے کے لیے' دہرانے کے لیے آتا ہے' تو ''مثانی'' دہرائی جانے والیاں' اس لیے کہ نماز کی ہر رکعت میں یہ سات آیات پڑھتے ہیں۔ دن رات میں' ایک مسلمان کئی مرتبہ نماز میں ان سات آیات کا ورد کرتا ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾ (الحجر)

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم !) ہم نے آپ کو سات دہرائی جانے والی آیات عطا فرمائی ہیں اور قرآن عظیم عطا فرمایا ہے۔''

اس قرآن عظیم کے بارے میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے مراد بھی سورۃ الفاتحہ ہی ہے۔ یہ اپنی جگہ مجسّم قرآن ہے' مکمل قرآن ہے' قرآن عظیم ہے۔ یہ سورۃ الفاتحہ کی ثنا ہے جو اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے' جس کا یہ کلام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے مزید سن لیجیے۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ ایک انصاری صحابی ہیں' اُن کا ایک خاص وصف خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا: ((أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ))[٧] یعنی تمام صحابہؓ کی جماعت میں قرآن کی قراءت سے سب سے زیادہ واقف اُبی بن کعب ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اندازِ تعلیم و تربیت بڑا فطری تھا۔ آپؐ

سوال کیا کرتے تھے تاکہ جو طالبِ علم ہے وہ خود متوجہ ہو جائے‘ غور کرے‘ اُس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو جائیں۔ آپ ﷺ نے اُبی بن کعب سے سوال کیا: ’’کیا مَیں تمہیں وہ سورت تلقین نہ کروں جس کے مثل نہ تورات میں نازل ہوئی‘ نہ انجیل میں نازل ہوئی اور نہ خود قرآن میں اس کی کوئی نظیر ہے؟‘‘ حضرت اُبیؓ نے فوراً کہا: بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! ’’حضور ﷺ کیوں نہیں!‘‘ ضرور فرمایئے! اب آپ ﷺ نے دوسرا سوال کیا: ((کَیْفَ تَقْرَأُ فِي الصَّلَاۃِ؟)) ’’اچھا تم مجھے یہ بتاؤ کہ نماز میں تم کیا پڑھتے ہو؟‘‘ اُبی بن کعبؓ نے سورۃ الفاتحہ پڑھی تو حضور ﷺ نے فرمایا:

((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا أُنْزِلَتْ فِي التَّوْرَاةِ وَلَا فِي الْإِنْجِيلِ وَلَا فِي الزَّبُورِ وَلَا فِي الْفُرْقَانِ مِثْلُهَا، وَإِنَّهَا سَبْعٌ مِنَ الْمَثَانِي، وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ الَّذِي أُعْطِيتُهُ))(۸)

’’اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے‘ اس سورت کے مثل نہ تورات میں نازل ہوئی‘ نہ انجیل میں‘ اور نہ خود قرآن میں اس کے ہم پلہ کوئی سورت ہے۔ یہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا ہوئی ہے۔‘‘

یہ بات مَیں نے کئی مرتبہ آپ کو بتائی ہے کہ قرآن مجید میں سورتیں جوڑوں کی صورت میں ہیں۔ آخری دو سورتیں ’’معوّذتین‘‘ جوڑا ہیں‘ سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر جوڑا ہیں‘ لیکن سورۃ الفاتحہ کا کوئی جوڑا نہیں‘ یہ یکتا ہے‘ بے مثل ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا: ’’جس کی نظیر نہ تورات میں اتری‘ نہ انجیل میں اور خود قرآن میں بھی اس کی مثل موجود نہیں ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کے کلام کی عظمت سے خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ سے زیادہ واقف کون ہو سکتا ہے؟ ؎ قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری! ’’ہیرے اور موتی کی قدر و قیمت کوئی بادشاہ جانتا ہے یا جوہری جانتا ہے۔‘‘ ایک بے چارہ دہقان کیا جانے گا! وہ شیشے کے ٹکڑے اور ہیرے موتی میں کیا فرق کرے گا! چنانچہ سورۃ الفاتحہ کی عظمت میں نے ان دونوں حوالوں سے بتادی۔

آیت بسم اللہ: سورۃ الفاتحہ کا جزو ہے یا نہیں؟

اب آیئے چوتھی بات کی طرف کہ اس سورۂ مبارکہ کی آیات کی تعداد تو مجمع علیہ ہے' کوئی اختلاف نہیں کہ یہ سات آیات ہیں۔ وہ تو ظاہر بات ہے قرآن کی نص ہے ﴿سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ﴾' اس میں کوئی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ اس میں ایک اختلاف یہ ہے کہ بعض ائمہ کرام آیت بسم اللہ کو بھی سورۃ الفاتحہ کا جزو مانتے ہیں' جبکہ اکثر ائمہ آیت بسم اللہ کو اس کا جزو نہیں مانتے۔ ہمارے ائمہ اربعہ میں سے ایک بہت بڑے امام' امام شافعیؒ اور فنِ قراءت کے ائمہ میں سے بھی بعض اس کے قائل ہیں کہ آیت بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کا جزو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھتے ہوں گے کہ بعض لوگ جہری نماز پڑھتے وقت بسم اللہ بھی بلند آواز سے پڑھتے ہیں: ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝﴾ اور جن لوگوں کی یہ رائے نہیں ہے وہ آیت بسم اللہ بلند آواز سے نہیں پڑھتے۔ جن حضرات کے نزدیک آیت بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کا جزو ہے وہ ﴿صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ۝﴾ کو ایک آیت سمجھتے ہیں۔ اس طرح آیات کی تعداد سات ہی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ قرآنی مصحف میں بقیہ تمام آیات کے آخر میں گول آیت کا نشان دیکھیں گے' البتہ اس آیت میں ''اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ'' کے بعد پانچ کا ہندسہ ہوتا ہے اور اس کے نیچے چھ کا عدد لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ چھٹی آیت ہے' لیکن چونکہ متفق علیہ نہیں ہے اس لیے آیت کا نشان گول دائرہ نہیں لگاتے۔ اس طرح اِن حضرات کے نزدیک ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝﴾ ایک آیت' ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝﴾ دوسری آیت' ﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝﴾ تیسری آیت' ﴿مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝﴾ چوتھی آیت' ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾ پانچویں آیت' ﴿اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝﴾ چھٹی آیت' ﴿صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ۝﴾ ساتویں آیت بنتی ہے۔

دوسری رائے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی ہے اور ائمہ فن میں سے بھی بہت سارے قراء اس رائے کے ماننے والے ہیں۔ یہ حضرات بسم اللہ کو سورۃ الفاتحہ کا جزو نہیں مانتے۔ وہ

آیت ضرور ہے لیکن سورۃ الفاتحہ سے علیحدہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ آیت بسم اللہ علیحدہ ہے اور سورۃ الفاتحہ شروع ہو رہی ہے ﴿ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ ﴾ سے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں چونکہ احناف کی غالب اکثریت ہے' جہری نماز جب بھی پڑھی جاتی ہے تو امام قراءت ﴿ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ ﴾ سے شرع کرتا ہے۔ بسم اللہ اگر وہ پڑھتا بھی ہے تو خاموشی سے پڑھتا ہے' اس کی جہری قراءت نہیں کرتا۔

مَیں اگرچہ ان معاملات میں اپنی رائے دینا پسند نہیں کرتا' جہاں اتنے بڑے بڑے ائمہ کے درمیان اختلاف ہو' اُس میں ہم جیسوں کو بات کرنا زیب نہیں دیتا' لیکن اس میں مجھے ایک حدیثِ قدسی سے راہنمائی ملی ہے جس کی روشنی میں آیت بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کا جزو نہیں ہے۔ یہ حدیث قدسی ہے۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ اس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نقل فرما رہے ہیں۔ اُس میں ایک بات قطعی طور پر سامنے آئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ حدیث امام شافعیؒ تک نہ پہنچی ہو۔ حدیثوں کی جمع وتدوین میں بڑا وقت لگا ہے۔ ائمہ فقہاء کے زمانے میں ساری حدیثیں تو موجود نہیں تھیں۔ امام مالکؒ کے پاس وہی احادیث موجود تھیں جو انہوں نے ''موطا'' میں درج کر دی ہیں تو اس میں کسی پر الزام نہیں دھرا جاسکتا۔ امام ابوحنیفہؒ کے زمانے تک بھی بہت کم احادیث جمع ہوئی تھیں۔ امام احمد بن حنبلؒ ائمہ اربعہ میں سے آخری ہیں' ان کے زمانے میں احادیث کے بڑے ذخیرے جمع ہو چکے تھے۔ چونکہ امام شافعیؒ پہلے زمانے کے ہیں' اس لیے عین ممکن ہے کہ یہ روایت انہیں نہ پہنچی ہو۔ اگر پہنچی ہوتی تو وہ یقیناً یہی رائے قائم کرتے۔ یہ مسلم شریف کی حدیث ہے' معمولی درجے کی روایت نہیں' بالکل صحیح ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔ بعد میں ہم یہ حدیث تفصیل سے پڑھیں گے' مطالب کے بیان کے ضمن میں اسے تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے رکھوں گا' اس وقت اس مسئلے کے حل کے لیے رکھ رہا ہوں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ((قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : قَسَمْتُ الصَّلَاۃَ بَیْنِي وَبَیْنَ عَبْدِي نِصْفَیْنِ)) ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَیں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم

کر دیا ہے۔‘‘((وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ)) ’’اور میرے بندے کے لیے ہے جو اُس نے مانگا‘‘۔ یہ جملہ تو حدیث قدسی ہے۔ یہاں تک تو اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا اور حضورﷺ نے اسے نقل کیا۔ اب حضورﷺ فرما رہے ہیں:((فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ)) ’’جب بندہ کہتا ہے :الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ‘‘ ((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: حَمِدَنِي عَبْدِي)) ’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری حمد کی‘‘۔((وَإِذَا قَالَ: الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ)) ’’اور جب بندہ کہتا ہے : الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ‘‘ ((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: أَثْنٰى عَلَيَّ عَبْدِي)) ’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری ثنا کی‘‘۔ ((وَإِذَا قَالَ: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ)) ’’اور جب بندہ کہتا ہے: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ‘‘ ((قَالَ: مَجَّدَنِي عَبْدِي)) ’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی‘‘ ((وَقَالَ مَرَّةً: فَوَّضَ إِلَيَّ عَبْدِي)) ’’اور ایک دفعہ فرمایا: میرے بندے نے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا۔‘‘ ((فَإِذَا قَالَ: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ)) ’’اور جب بندہ کہتا ہے : اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ‘‘ ((قَالَ: هٰذَا بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ)) ’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ میرے اور میرے بندے کے مابین ہے‘ اور مَیں نے اپنے بندے کو دیا جو اُس نے مانگا‘‘ ((فَإِذَا قَالَ: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ)) ’’اور جب بندہ کہتا ہے : اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ قَالَ: هٰذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ)) ’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ میرے بندے کا حصہ ہے اور میرے بندے کا ہو گیا جو اُس نے مجھ سے مانگا۔‘‘(۹)

یہ حدیث پوری سورۃ الفاتحہ کی شرح ہے اور اس میں آیت بسم اللہ کا ذکر نہیں۔ یہ حدیثِ نبویؐ سے بہت قوی دلیل ہے۔ اگر آیت بسم اللہ اس سورۃ کا جزو ہوتی تو اس حدیث کو بسم اللہ سے شروع ہونا چاہیے تھا۔ پھر ابتدا یوں ہوتی: جب بندہ کہتا ہے بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم تو اللہ تعالیٰ جواب میں کچھ فرماتا‘ جبکہ اس کا کوئی ذکر نہیں۔

لہٰذا اس حدیث کو اس وقت صرف حوالے کے طور پر نوٹ کر لیجیے کہ بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کا حصہ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان ائمہ فنِ قراءت کی رائے بہت قوی ہے جو آیت بسم اللہ کو سورۃ الفاتحہ کا جزو نہیں سمجھتے۔ لیکن اس کے باوجود اس اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ اگر ائمہ دین میں سے دوسرے بہت بڑے امام دوسری رائے کے قائل ہیں تو کوئی بات نہیں' اور ان کی رائے پر کوئی عمل کر رہا ہے تو اس پر منفی ردِّعمل کا اظہار نہیں کرنا چاہیے' گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہ محسوس نہ کریں کہ دوسری رائے رکھنے والے کچھ اور ہو گئے اور ہم کچھ اور ہو گئے' بلکہ فرق صرف یہ ہے کہ دونوں کی اجتہادی رائے مختلف ہے۔

لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَا يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ

پانچویں چیز: اس روایت سے دو نتائج نکل رہے ہیں' مَیں ان کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ پہلا یہ کہ ''الصَّلَاة'' اصل نماز یہی سورۃ الفاتحہ ہی ہے۔ حدیث کے الفاظ کیا ہیں؟ ((قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ)) ''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر لیا ہے۔'' کیا معلوم ہوا؟ جبکہ نماز میں تو سجدہ بھی ہے' رکوع بھی ہے' تشہد بھی ہے' جلسہ بھی ہے' قعدہ بھی ہے' بہت سارے اعمال ہیں۔ اصل نماز سورۃ الفاتحہ ہے' یہ نماز کا لُبِّ لُباب ہے' نماز کا خلاصہ ہے' نماز کی روح ہے' نماز کا جوہر ہے۔ حدیث میں ساری گفتگو سورۃ الفاتحہ کی ہے۔ یہی بات ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بایں الفاظ فرمائی: ((لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ))[10] ''جس شخص نے سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھی اُس کی کوئی نماز نہیں۔'' البتہ یہاں بھی ایک باریک سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ سورۂ فاتحہ نماز کا جزوِ لازم ہے۔ جب ایک شخص نماز پڑھے گا تو سورۂ فاتحہ کے بغیر اُس کی کوئی رکعت ہے ہی نہیں۔ البتہ جماعت کی صورت میں اس میں اختلاف ہو جاتا ہے کہ آپ رکوع میں مل گئے تو کیا آپ کی رکعت ہو گئی؟ جبکہ سورۂ فاتحہ تو نہیں پڑھی گئی۔ ایک مسلک یہ کہتا ہے کہ چونکہ سورۂ فاتحہ پڑھنے کا موقع نہیں ملا' لہٰذا رکعت شمار نہیں ہو گی' جبکہ ایک مسلک یہ ہے کہ آپ رکوع میں امام کے ساتھ شریک ہو گئے

تو رکعت شمار ہوگی۔ نماز کا یونٹ ’’رکعت‘‘ ہے اور یہ رکوع سے ماخوذ ہے‘ چنانچہ جس کو رکوع مل گیا اس کو رکعت مل گئی۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب ایک شخص اکیلا نماز پڑھ رہا ہو تب تو کوئی اختلاف ہے ہی نہیں کہ سورۃ فاتحہ کے بغیر کوئی رکعت نہیں۔ ایسی رکعت تو ہے کہ جس میں صرف سورۃ فاتحہ ہی ہے‘ اس کے بعد آپ کچھ اور نہیں ملاتے‘ لیکن یہ کہ بغیر سورۃ فاتحہ کے کوئی رکعت نہیں‘ یہ بات متفق علیہ ہے‘ اس میں اختلاف ہی نہیں۔ معلوم ہوا کہ بنیادی بات تو متفق علیہ ہے کہ سورۃ فاتحہ نماز کا جزوِ لازم ہے‘ اختلاف اُس وقت ہو رہا ہے جب آپ جماعت کی شکل میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ اس میں ایک رائے یہ ہے کہ اگر آپ نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی‘ لیکن رکوع مل گیا‘ تب بھی آپ کی رکعت ہوگئی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ رکعت نہیں ہوئی‘ سورۃ فاتحہ لازم ہے‘ اگر پڑھنے کا موقع مل گیا ہے تب تو رکعت ہوگئی وگرنہ رکعت نہیں ہوئی۔

پہلی رائے کے قائل حضرات کے نزدیک اگر آپ امام کے ساتھ ہیں تو امام کی قراءت ہی آپ کی قراءت ہے اور آپ کو اپنی پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مسلک اس کو ’’وفد‘‘ پر قیاس کر رہا ہے۔ جب ہم جماعت کی شکل میں ہوتے ہیں تو گویا وفد کی صورت میں اللہ کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ وفد کا ایک ترجمان (spokesman) ہوتا ہے‘ وہ ترجمان جو بات عرض کرتا ہے وہ پورے وفد کی طرف سے شمار ہوتی ہے۔ لہٰذا امام جب سورۃ فاتحہ پڑھ رہا ہے تو اُس نے گویا تمام مقتدیوں کی طرف سے قراءت کر دی۔ یہ رائے قائم کرتے ہوئے بہت سی مصلحتیں سامنے آئی ہوں گی۔ فرض کیجیے کوئی ذرا بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیتا ہے تو لوگوں کی توجہ منتشر ہوگی۔ اجتماعیت کا تقاضا ہے کہ باقی لوگ خاموش رہیں‘ صرف امام ہی پڑھے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے‘ حنفی مسلک یہی ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ جب حضور ﷺ نے فرمادیا کہ ہر رکعت کے اندر سورۃ فاتحہ پڑھنا لازمی ہے اور جس شخص نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی اُس کی تو نماز ہی نہیں‘ لہٰذا چاہے آپ امام کے ساتھ ہوں یا اکیلے ہوں‘ آپ کو سورۃ فاتحہ پڑھنی ہوگی‘ امام بھی پڑھ رہا

ہے اور آپ بھی پڑھیے۔ یہ دوسری رائے امام شافعیؒ کی ہے‘ اور ہمارے ہاں موجود مسلک اہلِ حدیث کی بھی یہی رائے ہے۔

تیسری رائے بین بین ہے اور یہ امام مالکؒ کی رائے ہے۔ نیز امام ابوحنیفہؒ کے ایک شاگرد امام ابومحمدؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ اُنہوں نے درمیانی راستہ نکالا کہ جب امام جہری رکعت میں بلند آواز سے پڑھ رہا ہو تو تم خاموش رہو اور سنو۔ اس طرح قرآن کے حکم پر عمل کرو: ﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا﴾ (الاعراف:۲۰۴) ’’جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔‘‘ اور جب سِرّی رکعت ہو کہ امام بھی خاموشی سے پڑھ رہا ہے تو مقتدی بھی سورۃ فاتحہ پڑھے۔

ہمارے ہاں یہ تین مسالک پائے جاتے ہیں۔ پہلا مسلک یہ ہے کہ جب امام قراءت کر رہا ہو تو آپ کو کسی صورت میں بھی نہیں پڑھنی‘ نہ جہری قراءت والی نماز میں اور نہ سِرّی قراءت والی نماز میں۔ مسلک حنفی کا مشہور قول یہی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ہر صورت میں سورۃ فاتحہ پڑھنی چاہیے‘ خواہ نماز جہری ہو یا سِرّی۔ امام بھی پڑھے اور مقتدی بھی پڑھیں۔ ہمارے ہاں اہلِ حدیث مسلک اسی پر عمل کر رہا ہے۔ تیسری رائے بیچ بیچ کی ہے جو امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی ہے کہ جو جہری رکعت ہے اُس میں خاموش رہو‘ خود نہ پڑھو بلکہ سنو اور جو سری رکعت ہے اُس میں تم خود بھی پڑھو۔

بہرحال یہ متفق علیہ چیز ہے‘ مجمع علیہ ہے کہ سورۃ فاتحہ نماز کا جزوِ لازم ہے‘ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اب یہ کہ جماعت کی شکل میں کیا ہونا چاہیے‘ زیادہ قرینِ مصلحت کیا ہے‘ قرینِ عقل کیا ہے‘ حضور ﷺ کے حکم کا تقاضا کیسے پورا ہو گا؟ قرآن کا یہ حکم کہ جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو توجہ سے سنو اور خاموش رہو‘ اس کا تقاضا کس طرح پورا ہو سکتا ہے؟ اس ضمن میں اجتہادی آراء ہیں‘ لہٰذا اس سے بددل نہیں ہونا چاہیے‘ سینہ کشادہ رکھنا چاہیے۔ امام شافعیؒ بھی ہمارے ہی امام ہیں‘ امام مالکؒ بھی ہمارے ہی ہیں‘ امام ابوحنیفہؒ بھی ہمارے ہی امام ہیں‘ امام محمدؒ بھی ہمارے ہی امام ہیں‘ امام احمد بن حنبلؒ بھی ہمارے ہی امام ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

آئندہ صفحات میں اس سورہ مبارکہ کے مضامین کا تجزیہ ہوگا۔ پہلے بحیثیتِ مجموعی اس کا تجزیہ پیش کروں گا' اس کے بعد تین علیحدہ علیحدہ حصے معیّن کر کے اس پر تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(جاری ہے)

حواشی

(۱) الکافیۃ: مختصراً ابن کثیر، مقدمہ سورۃ الفاتحہ۔

(۲) الشافیۃ: مختصر ابن کثیر، مقدمہ سورۃ الفاتحہ۔

(۳) صحیح البخاری کتاب فضائل القرآن، باب فضل سورۃ الفاتحہ۔

(۴) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ، ح۸۲۰۔

(۵) صحیح البخاری وصحیح مسلم، بحوالہ مشکاۃ المصابیح'ح۸۲۲۔

(۶) صحیح البخاری، کتاب التفسیر، ح ۴۲۰۴ باب قولہ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝﴾

(۷) سنن الترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل و زید بن ثابت و اُبی....

(۸) سنن الترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء فی فضل فاتحۃ الکتاب۔ امام البانی نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو: سنن ابن ماجہ ح ۱۵۴ ومسند احمد ۱۸۴/۳ ومشکاۃ المصابیح، ح ۴۱۶۔

(۹) صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ۔

(۱۰) صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، ح۳۹۴۔

❀❀❀

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں'
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاءاللہ!)

اسلام میں خواتین کا مقام

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خطبہ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد!

مجھے اس وقت قرآن حکیم کی رو سے خواتین کے مقام پر گفتگو کرنی ہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت یہ بحث جس طرح چل نکلی ہے وہ آپ کے علم میں ہے۔ جس طرح کے دو متضاد خیالات اور رجحانات شدّومد کے ساتھ ہمارے اخبارات میں پیش ہو رہے ہیں' ان سے ہر پڑھا لکھا شخص بخوبی واقف ہے۔ سب سے پہلے تو مجھے ایک اصولی وضاحت کرنی ہے کہ میرا ایک مستقل موقف ہے' اسی پر میری عملی جِدّوجُہد مبنی ہے۔ چنانچہ میرے کچھ خیالات ونظریات ہیں سماجی مسائل کے بارے میں بھی' معاشی مسائل کے بارے میں بھی اور سیاسی مسائل کے بارے میں بھی۔ معاشی مسائل کے حوالے سے میری آراء میں سے کسی ایک کو موضوع بنا کر اگر کوئی مہم چلائی جائے گی تو مجھے اندیشہ ہے کہ موجودہ حالات میں اس کا سارا فائدہ کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کو پہنچے گا۔ اسی طریقے سے میرے سیاسی نظریات پر اگر کوئی عوامی تحریک اٹھائی جائے تو اس کا سارا فائدہ سیکولر جمہوریت کے قائدین کو پہنچے گا۔ اسی طرح جو سماجی برائیاں ہیں ان میں سے کسی ایک کو موضوع بنا کر کوئی مہم چلانا' کوئی تحریک برپا کرنا بھی میرے پیش نظر نہیں ہے۔ میرا مستقل تجزیہ یہ ہے کہ ہماری اصل کمزوری اور تمام برائیوں کی جڑ ہمارا دین سے دور ہو جانا' ہمارے ایمان کا کمزور ہو جانا اور مضمحل ہو جانا ہے۔ یہیں سے وہ ساری شاخیں پھوٹتی ہیں۔ چنانچہ مختلف شاخوں کے ساتھ کشتی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا بلکہ اصل ہدف اس جڑ کو بنانا ہوگا۔

میری جو عملی جِدّوجُہد ہے' جو بھی حقیر توانائیاں ہیں' قوتیں ہیں' صلاحیتیں ہیں' اوقات ہیں وہ دو کاموں پر صرف ہو رہے ہیں۔ پہلا کام قرآن حکیم کے پیغام کو زیادہ سے زیادہ

وسیع پیمانے پر اور اعلیٰ سطح پر پھیلانے اور عام کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ اسے دعوت رجوع القرآن کہہ لیں، تعلّم وتعلیمِ قرآن کہہ لیں۔ میری جو مساعی ہے ان میں پیش نظر یہ ہے کہ قرآن ہی اصل میں ایمان کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ ایمان کے اضمحلال‘ ایمان کے ضعف کا ازالہ اگر ہوسکتا ہے تو اسی قرآن کے ذریعے سے۔ جب ایمان پیدا ہو جائے اور اپنے دینی فرائض کا احساس ابھرے تو پھر جِدّ وجُہد کی دوسری سطح یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو منظّم کیا جائے۔ ایک جماعتی شکل اختیار کر کے وہ کوشش کریں کہ اس معاشرے میں یہ دینی تبدیلی پائیدار‘ محکم بنیادوں پر اور وسیع پیمانے پر برپا ہو۔ اس کے لیے تنظیم اسلامی کا قیام ہوا‘ جو ابھی ایک بہت ہی مختصر سا قافلہ ہے لیکن بہرحال میری توانائیاں اس میں لگ رہی ہیں۔ لہٰذا یہ دو اصل کام ہیں جن میں مَیں لگا ہوا ہوں۔ باقی میرے سارے کام ضمنی ہیں۔ اگر ملک کی مجلسِ شوریٰ میں شمولیت ہوگئی تو وہ میری ایک ضمنی مصروفیت ہے‘ بنیادی مصروفیت نہیں۔ اس کی گواہی ہر وہ شخص دے گا کہ جو مجھ سے کسی بھی درجے میں واقف ہے۔ ۱۶ سال سے اب میں لاہور ہی میں ہوں اور یہاں کا گوشہ گوشہ اور چپا چپا گواہی دے گا کہ میں نے کن کن کونوں کھدروں میں پہنچ کر قرآن مجید کی دعوت پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ مطالعہ قرآن کے حلقے قائم کیے ہیں۔ بہرحال میرے نزدیک اصلاحی طرز کی جِدّوجُہد یا سیاسی طرز کی کوشش سے اقامتِ دین کا فرض ادا کرنا اگر ناممکن نہیں تو محال کے درجے میں ضرور ہے۔ اس کے لیے ایک انقلابی جِدّوجُہد کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنی امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی ہے کہ صحیح اسلامی بنیادوں پر انقلاب برپا ہو۔

دینی اور اخلاقی سطح پر عورت کا مقام

سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ از روئے اسلام یا از روئے قرآن عورت کا مقام کیا ہے۔ بالخصوص جو اصل مسئلہ ہے کہ مَرد کے ساتھ مساوات یا عدمِ مساوات کی کیفیت جو ہمارے دین کا مزاج ہے‘ ہمارے سامنے آئے۔ جہاں تک دینی اور اخلاقی سطح کا تعلق ہے‘ قرآن اور اسلام کی تعلیمات مَرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں

کرتیں۔ نیکی اور بدی کمانے میں ان کا ایک مکمل اخلاقی تشخص ہے۔ مَرد کا اپنا ہے‘ عورت کا اپنا ہے۔ مَرد کوئی نیکی کماتا ہے تو اپنے لیے اور بدی کماتا ہے تو اس کا بوجھ اُس پر ہوگا جبکہ عورت نے اگر کوئی نیکی کمائی ہے تو اپنے لیے اور کوئی غلط کام کیا ہے تو اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا۔ سورۃ التحریم میں یہ مضمون بہت کھل کر آیا ہے کہ عورت کا ایک کامل تشخص ہے‘ وہ دینی یا اخلاقی اعتبار سے مَرد کے تابع نہیں۔ چنانچہ اس سورہ میں یہ اَمر نمایاں کیا گیا کہ بہترین مَردوں کے گھر میں بدترین عورتیں رہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویوں کی مثال دی گئی۔ اگر عورت دینی اور اخلاقی اعتبار سے مَرد کے تابع ہوتی تو حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویاں دینی امور میں ان کی اطاعت کرتیں۔

﴿كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا﴾ (آیت ۱۰)

’’وہ دونوں ہمارے دو بہت صالح بندوں کے عقد میں تھیں تو انہوں نے ان سے خیانت کی۔‘‘

معلوم ہوا کہ اخلاقی اور دینی اعتبار سے ان کا معاملہ بالکل جدا ہے۔ سورۃ التحریم میں مثال پیش کی گئی کہ حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا فرعون کے گھر میں تھیں۔ فرعون اللہ کا دشمن‘ اللہ کا باغی لیکن اس کی بیوی ایک نیک اور خدا پرست خاتون۔ معلوم ہوا کہ دینی اور اخلاقی پہلوؤں کے اعتبار سے عورت مَرد کے تابع نہیں ہے۔ عورت کا ایک کامل اخلاقی اور دینی تشخص ہے۔ سورۂ آل عمران کے آخری حصے میں فرمایا گیا:

﴿اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُکُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ﴾ (آیت ۱۹۵)

’’کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے کسی بھی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں‘ خواہ وہ (عمل کرنے والا) مَرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے ہی میں سے ہو۔‘‘

یہ تمدن کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ان کی جسمانی ساخت مختلف ہے‘ نفسیاتی ساخت مختلف ہے۔ ایسا تمدنی ضرورت کے تحت ہے۔ انسان ہونے کے ناطے اگرچہ وہ بالکل مساوی ہیں‘ تاہم دینی اور اخلاقی اعتبار سے دونوں کا تشخص جداگانہ ہے۔ وہ اپنی اپنی شخصیت

کے خود ذمہ دار ہیں۔ یہ بات سورۃ الاحزاب کی ایک آیت میں بڑے ہی پیارے انداز میں آئی ہے‘ جو قرآن مجید کی بڑی طویل آیت ہے۔ فرمایا گیا:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾﴾

’’یقیناً مسلمان مَرد اور مسلمان عورتیں‘ اور مؤمن مَرد اور مؤمن عورتیں‘ اور فرماں بردار مَرد اور فرماں بردار عورتیں‘ اور راست باز مَرد اور راست باز عورتیں‘ اور صبر کرنے والے مَرد اور صبر کرنے والی عورتیں‘ اور خشوع کرنے والے مَرد اور خشوع کرنے والی عورتیں‘ اور صدقہ دینے والے مَرد اور صدقہ دینے والی عورتیں‘ اور روزہ رکھنے والے مَرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں‘ اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مَرد اور (اپنی شرم گاہوں کی) حفاظت کرنے والی عورتیں‘ اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مَرد اور ذکر کرنے والی عورتیں‘ اللہ نے ان سب کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر تیّار کر رکھا ہے۔‘‘

مطلب یہ کہ دینی‘ اخلاقی‘ روحانی لحاظ سے جتنے بھی مقامات ہیں‘ اعلیٰ مدارج ہیں ان میں کوئی روک نہیں ہے کہ عورت وہاں نہ پہنچ سکتی ہو یا وہ کسی کمتر درجے کی حامل ہو‘ بلکہ ان پہلوؤں سے اس کا تشخص کامل ہے اور وہ مَرد کے ساتھ کامل مساوات رکھتی ہے۔

لفظ ’’کسب‘‘ کی تشریح

اسی طرح سورۃ النساء میں فرمایا گیا:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ﴾ (آیت ۳۲)

’’مَردوں کے لیے حصّہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں‘ اور عورتوں کے لیے حصّہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں۔‘‘

یہ بھی درحقیقت اسی اخلاقی اور دینی سطح کا موضوع ہے جو اس آیت میں زیر بحث آیا ہے۔ اس آیت کو خاص طور پر یہاں اس لیے quote کیا گیا ہے کہ ہماری کچھ بہنیں اس سے بڑے مغالطے میں پڑ گئی ہیں کہ یہاں لفظ ''کسب'' چونکہ مَردوں اور عورتوں دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے' اس کے معنی یہ ہوئے کہ عورت بھی اسی طرح کما سکتی ہے جیسے ایک مَرد کما سکتا ہے۔ جان لیجیے کہ قرآن مجید میں لفظ ''کسب'' اکثر و بیشتر نیکی یا بدی کمانے کے لیے آیا ہے۔ اس دنیا میں رزق کے معاملے کو تو قرآن ''فضل'' قرار دیتا ہے کہ یہ اللہ کا فضل ہے' تمہاری کمائی نہیں ہے۔ محنت تم کرتے ہو' مشقت تم کرتے ہو لیکن جو کچھ تمہیں ملتا ہے اسے کبھی یہ نہ سمجھنا کہ یہ میری محنت اور مشقت کا حاصل ہے بلکہ یہی سمجھنا کہ یہ اللہ کا فضل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم محنت کیے جاؤ اور ہاتھ کچھ بھی نہ آئے! یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ذہین اور فطین انسان سونے میں ہاتھ ڈالتا ہے اور وہ راکھ بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک عام شخص مٹی میں ہاتھ ڈالتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے' رزق کی کشادگی اور تنگی اُسی کی جانب سے ہے۔ یہ اصل میں فضل ہے۔ میرے علم کی حد تک قرآن مجید میں کمائی کے معنی میں کسب کا لفظ صرف ایک مرتبہ آیا ہے اور وہ سورۃ البقرۃ کا وہ مقام ہے جہاں انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا گیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ......﴾ (آیت ۲۶۷)

''اے ایمان والو! اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو.....''

لفظ ''کسب'' دونوں معنی میں آ جاتا ہے' نیکی کمانے میں بھی اور بدی کمانے میں بھی' تاہم اکتساب کا لفظ عام طور پر صرف بدی کمانے کے لیے آتا ہے۔ یہاں بھی درحقیقت اخلاقی اور دینی اعتبار سے یہ بات کہی گئی ہے کہ مَردوں کے لیے وہ ہے جو مَردوں نے کمائی کی اور عورتوں کے لیے وہ ہے کہ جو عورتوں نے کمایا۔ مَردوں کی نیکی ہے تو وہ ان کے لیے ہے' اس سے عورتوں کو فائدہ نہیں ہو جائے گا جبکہ عورتوں کی کوئی نیکی ہے تو وہ ان کے لیے ہے' وہ مَردوں کے حساب میں درج نہیں ہو جائے گی۔

یہ بھی نوٹ کیجیے کہ ﴿نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا ؕ﴾ کے الفاظ ہیں‘ ورنہ دنیاوی کمائی کے لیے یہ ہوتا تو ’’نَصِیب‘‘ نہیں‘ پھر تو پوری کمائی ہے۔ اگر پچاس روپے یومیہ کی دیہاڑی کسی مَرد نے کی ہے تو پچاس روپے پورے ملیں گے‘ نَصِیْبٌ مِّنْہُ نہیں ملیں گے کہ اس کا ایک جزو ملے۔ چنانچہ یہاں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان جو نیکی کماتا ہے‘ ضروری نہیں ہے کہ اسی مقدار میں اس کا بدلہ بھی مل جائے۔ ہوسکتا ہے کہ حسن نیت میں کہیں کوئی کمی ہو‘ لہٰذا اس کا اجر کم ہو جائے۔ ہوسکتا ہے کہ اخلاص پورا ہو تو اسے اس کا اجر زیادہ مل جائے۔ لہٰذا یہ معاملہ ﴿لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ ؕ﴾ اخلاقی کمائی اور دینی اعمال کے لیے ہے‘ نہ کہ دنیاوی کمائی جس کے حوالے سے ہم عام طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔

عورت کا قانونی تشخّص

غور کیا جائے تو تاریخ انسانی میں شاید پہلی مرتبہ اسلام نے عورت کو قانونی تشخص عطا کیا‘ لیگل سٹیٹس دیا۔ اس کی ایک قانونی حیثیت ہے‘ وہ ملکیت رکھ سکتی ہے۔ یہ قانونی تشخص جس درجے میں اسلام نے عورت کو دیا ہے‘ میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی اور مذہب میں عورت کا وہ تشخص تسلیم کیا گیا ہو یا اسے دیا گیا ہو۔ روحانی اعتبار سے تو ہمیشہ سمجھا گیا ہے کہ عورت شر کی بنیاد ہے‘ یہ گندگی کی پوٹلی ہے۔ کہتے ہیں کہ evil کا لفظ Eve سے بنا ہے‘ یعنی حضرت حوا۔ یہ تصور عیسائیت کا ہے لیکن اسلام کا تصور یہ نہیں ہے۔ اس نے عورت کو بھرپور قانونی تشخص دیا ہے۔

البتہ جو لوگ بھی قرآن کی پیروی کرنا چاہتے ہیں وہ نوٹ کریں کہ قانونی سطح پر مَرد اور عورت کو برابر نہیں رکھا گیا۔ اخلاقی اور دینی سطح پر کامل مساوات ہے لیکن قانونی سطح پر ایسا نہیں ہے۔ قرآن مجید سے دو باتیں تو بالکل ایسی ثابت ہیں کہ جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ نمبر ایک یہ کہ اسلام نے بیٹیوں یا بیویوں کو وراثت کے اندر حصّہ دیا ہے لیکن یہ مَردوں کے برابر نہیں۔ بیٹی کا حصّہ بیٹے سے آدھا‘ ماں کا حصّہ باپ سے آدھا۔ کون شخص ہے کہ جو قرآن کا ماننے والا ہو‘ قرآن پر ایمان رکھتا ہو اور کسی درجے میں قرآن سے

واقف ہو اور یہ نہ جانتا ہو کہ کس قدر تفصیل سے قانونِ وراثت قرآن مجید میں آیا ہے۔ وہاں پر عورت کو وراثت میں جو حق دیا گیا ہے وہ مَرد سے آدھا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ چونکہ معاشی کفالت کا بوجھ اسلام مَرد پر ڈالتا ہے‘ لہٰذا اسے وراثت میں بھی دوہرا حصّہ دیا۔ بیٹی کو جو کچھ ملے گا وہ بیوی کی حیثیت سے لے کر کسی شوہر کے گھر چلی جائے گی اور اس کی اپنی کفالت بھی اس شوہر کے ذمہ ہے۔ لہٰذا یہ اب اس کی ایک پرسنل پراپرٹی کی حیثیت سے رہے گی۔ اسے اپنے شوہر کی کفالت نہیں کرنی ہے بلکہ وہ خود شوہر کے ذمے ہے۔ البتہ بیٹے کو آگے اپنے خاندان کی کفالت کرنی ہے۔ لہٰذا یہ بالکل منطقی طور پر جڑی ہوئی اور مربوط چیزیں ہیں کہ بیٹی کو حصّہ بیٹے کی نسبت سے آدھا دیا جائے گا۔

اسی طریقے سے قانون میں شہادت بڑی اہمیت رکھنے والی چیز ہے۔ اس حوالے سے بھی سورۃ البقرۃ کے آخری حصے میں ایک مَرد کے مقابلے میں دو خواتین کی گواہی برابر شمار کی گئی ہے۔ یہ صراحتاً مذکور ہے‘ اور یہ بھی بلاسبب نہیں ہے۔ قرآن نے وہیں بیان کیا کہ ’’ان میں سے اگر ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔‘‘ نسیان مَرد کو بھی لاحق ہوسکتا ہے‘ بھول مَرد بھی سکتا ہے لیکن قرآن مجید کا یہ انداز بتا رہا ہے کہ نسیان کا زیادہ امکان عورت کے معاملے میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ساخت ایسی بنائی ہے۔

﴿ اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَ ہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۴﴾ ﴾ (الملک)

’’کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ اور وہ بہت باریک بین ہے‘ ہر شے کی خبر رکھنے والا ہے۔‘‘

اس نے عورت کے مزاج میں جذبات کا عنصر غالب رکھا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ ’’نہ ہر زن زن است و نہ ہر مَرد مَرد‘ خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!‘‘ ہوسکتا ہے بہت سے مَرد عورتوں سے زیادہ جذباتی ہوں اور بہت سی عورتیں مَردوں کی نسبت زیادہ کول مائنڈڈ ہوں۔ لیکن یہ exceptions ہوں گی۔ جو ایوریج نکالیں گے تو معلوم ہوگا کہ مَرد زیادہ متحمل مزاج ہے جبکہ عورت کے اندر جذبات کا عنصر زیادہ ہے۔ یہ بھی درحقیقت فطرت

نے جو فرائضِ منصبی اس کے حوالے کیے ہیں ان کے ساتھ مناسبت رکھنے والی چیز ہے۔ اس اعتبار سے عورت کے معاملے میں نسیان کا زیادہ امکان ہے بنسبت مَرد کے۔ لٰہذا ہمارے ہاں گواہی کا نصاب یا تو دو مَرد ہیں۔ اگر ایک مَرد ہے تو ساتھ دو عورتیں گواہ ہوں تو وہ نصاب پورا ہو سکے گا۔ گویا اسلامی قانون میں عورت کی گواہی کو مَرد کی گواہی سے آدھا رکھا گیا ہے۔ چنانچہ یہ عورت پر اسلام کا بہت بڑا احسان ہے کہ اسے قانونی تشخص دیا گیا ہے لیکن یہ مَرد کے مساوی نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ فرق ہے۔

عورت بحیثیت ماں

عورت کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ ماں ہے۔ اس معاملے میں تو واقعہ یہ ہے کہ ماں کے ساتھ جس قدر احترام اور حسن سلوک کا حکم قرآن مجید اور احادیث نبویہؐ میں آیا ہے' شاید ہی کہیں اس کی نظیر ملے۔ سورۂ بنی اسرائیل' سورۃ الانعام' سورۃ النساء' سورۂ لقمان میں اللہ تعالیٰ کے حق کے فوراً بعد جو ذکر ہوتا ہے وہ والدین کے حق کا ہے:

﴿وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ﴾

(بنی اسرائیل : ۲۳)

''اور فیصلہ کر دیا ہے آپؐ کے رب نے کہ مت عبادت کرو کسی کی سوائے اُس کے' اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔''

والدین میں جب نسبت دیکھتے ہیں قرآن اور حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حسنِ سلوک کے حوالے سے والدہ کا حق والد کے مقابلے میں کم سے کم تین گنا ہے۔ چنانچہ سورۂ لقمان میں جب فرمایا کہ ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ﴾ ''ہم نے انسان کو تاکید کی ہے اُس کے والدین کے بارے میں'' تو اس کے فوراً بعد ماں کا ذکر ہے:

﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾﴾

''اُس کو اٹھائے رکھا اُس کی ماں نے (اپنے پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری جھیل کر' اور اُس کا دودھ چھڑانا ہوا دو سال میں' کہ تم شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا!

اور میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہوگا۔‘‘

ماں نے یہ جو خاص مشقت جھیلی ہے اور حمل‘ پیدائش‘ رضاعت اور تربیت کے حوالے سے جو خاص تکلیفیں اٹھائی ہیں اس کے اعتبار سے وہ حسنِ سلوک میں باپ کے مقابلے میں تین درجے مقدم ہے۔ یہ تین کا لفظ حدیث میں آ گیا ہے۔ حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر ایک صحابی نے پوچھا: ((مَنْ اَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ؟)) ’’تمام انسانوں میں میرے حسنِ سلوک کا اولین مستحق کون ہے؟‘‘ حضورﷺ نے فرمایا: ’’تیری ماں!‘‘ انہوں نے پھر سوال کیا: ان کے بعد کون؟ آپﷺ نے پھر فرمایا: ’’تیری والدہ!‘‘ تیسری مرتبہ پھر پوچھا: ان کے بعد کون؟ حضورﷺ نے پھر فرمایا: ’’تیری والدہ!‘‘ چوتھی مرتبہ پوچھا: ان کے بعد کون؟ تو فرمایا: ’’تیرے والد‘‘۔ (متفق علیہ) یہاں نبی اکرمﷺ نے قرآن حکیم کی اس آیت میں جو بات مضمر تھی اس کو کھول دیا۔ یہ تو آپﷺ کا فرضِ منصبی ہے کہ قرآن میں لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے جو بھی نازل کیا گیا‘ اسے آپؐ کھول کر بیان کریں: ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ۴۴)۔ لہٰذا حسن سلوک کے اعتبار سے والدہ تین درجے مقدم ہے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَلْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأُمَّهَاتِ)) ’’جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔‘‘

اس کو ہمیں objectively سمجھنا چاہیے کہ اسلام کا منشا کیا ہے۔ اسلامی قانون کا رجحان کیا ہے‘ میلان کیا ہے۔ قانونی اعتبار سے اولاد باپ کی ہے‘ ماں کی نہیں۔ اگر علیحدگی ہو جائے‘ طلاق ہو جائے تو اولاد پر والدہ کا کوئی قانونی کلیم نہیں ہے۔ سورۃ البقرہ میں جہاں رضاعت کے بڑے تفصیلی احکام آئے ہیں‘ بتایا گیا ہے کہ طلاق کے بعد اگر بچہ شیر خوار ہے تو یہ باپ کی مرضی پر ہے کہ وہ چاہے تو اس ماں سے اسے دودھ پلوائے جس کو طلاق دی گئی ہے۔ چنانچہ قانون کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں اولیت‘ اقدمیت‘ افضلیت باپ کی ہے جبکہ حسن سلوک اور ادب واحترام میں اس کو بیلنس کیا گیا ہے کہ تین درجے ماں کو مقدم رکھ دیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان چیزوں پر جب ہم غور کرتے ہیں تو یقین ہو جاتا

ہے کہ یہ قانون اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ عقل انسانی اس طرح کے معاملات کو حل نہیں کر سکتی۔ قانونی اعتبار سے مَرد کو اگر تفوق نہ دیا جائے تو خاندانی نظام میں گڑبڑ ہوتی ہے جبکہ مقصود اس نظام کو مضبوط رکھنا ہے۔ اگر قانونی اعتبار سے کسی کو زیادہ اختیار دے دیا گیا ہے تو اخلاقی سطح پر اس کی تلافی کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ نظام کسی حکیم مطلق ہستی ہی کا تجویز کردہ ہو سکتا ہے‘ انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس معاملے میں ہماری بہنوں کو خاص طور پر یہ سوچنا چاہیے کہ جوانی کے بعد بڑھاپا بھی آنے والا ہے۔ اگر مغربی تہذیب سے اتنی شیفتگی ہے اور اس کی اتنی دلدادگی ہو گئی ہے تو انہیں مغرب میں جا کر دیکھنا چاہیے کہ وہاں والدین کا حشر کیا ہوتا ہے‘ ان کا بڑھاپا کس حال میں گزرتا ہے۔ اس معاشرے میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی کوئی رمق نہیں رہی۔ والدین ترستے رہتے ہیں کہ کبھی ان کی اولاد آ کر مل لے‘ انہیں شکل ہی دکھا دے۔ حکومتی سطح پر ان کے لیے اہتمام ہے کہ بوڑھوں کے لیے علیحدہ ادارے قائم کر دیے گئے۔ وہاں ٹیلی ویژن بھی ان کے لیے موجود ہے‘ لیکن ٹیلی ویژن کا دیکھنا اور شے ہے جبکہ اپنے بیٹے یا بیٹی کو دیکھنا بالکل اور شے ہے جس کے لیے وہ ترستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ اگر اس تہذیب کو بحیثیت کُل اختیار کرنا ہے تو پھر ان نتائج کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے‘ اور وہ نکل کر رہیں گے۔ جو بھی اس کے نتائج نکلے ہیں ان کو ہم جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں‘ بچشمِ سر اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہ ایسی کوئی علمی ونظری بات نہیں ہے کہ جس کو verify نہ کیا جا سکے۔

عورت بحیثیت بیٹی

اسی طریقے سے بیٹی کی حیثیت سے اسلام نے جو مقام دیا ہے‘ اس کے حوالے سے ذرا عرب کا ماحول ذہن میں لائیے کہ جہاں بیٹی کی پیدائش کے بعد باپ اپنا چہرہ چھپائے پھر رہا ہے‘ شرمندہ ہے۔ لوگوں کے سامنے آ نہیں سکتا جب تک کہ وہ اس بیٹی کو کہیں کسی گڑھے میں جا کر دفن نہ کر آئے۔ قرآن حکیم میں قیامت کی ہولناکیوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا ہے:

﴿وَاِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ ۞ بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۞﴾ (التکویر)

’’اور جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا‘ کہ وہ کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی تھی؟‘‘

اسلام نے آ کر اس صورت حال کو بدلا۔ اس وقت چونکہ اختصار سے کام لینا ہے‘ صرف ایک حدیث پر اکتفا کر رہا ہوں۔ حضرت انس ؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَن عَالَ جَارِيَتَيْنِ حتَّى تَبْلُغا جاءَ يَومَ القِيامَةِ أنا وَهُوَ، وضَمَّ أصابِعَهُ)) (صحیح مسلم: ۲۶۳۱)

’’جس شخص نے دو بیٹیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں‘ وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ مَیں اور وہ اس طرح (ساتھ ساتھ) ہوں گے (جیسے کہ یہ انگلیاں جڑی ہوئی ہیں) حضور ﷺ نے اپنی انگلیوں کو جوڑ کر بتایا۔‘‘

اگر کوئی شخص پوری خوش دلی کے ساتھ‘ محبت کے ساتھ‘ شفقت کے ساتھ بچیوں کی پرورش کر رہا ہے تو اس کا اجر وثواب ہے۔ اور بھی بہت سی حکمتیں ہوں گی‘ اس وقت ان کا استحصاء مقصود نہیں ہے‘ لیکن یہ بھی حکمت نظر آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو بیٹیاں دیں۔ چار بیٹیوں کا باپ بنایا‘ چاروں کو حضور ﷺ نے محبت اور شفقت کے ساتھ پالا ہے۔ حضرت فاطمہ ؓ آتی تھیں تو حضور ﷺ کھڑے ہو جاتے تھے‘ ان کی پیشانی پر بوسہ دیتے تھے‘ ان کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دیتے تھے۔ بیٹیوں کا یہ احترام محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے کر کے دکھایا ہے۔ یہ بھی ایک حکمت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہ لوگوں کے سامنے یہ نمونہ آئے کہ اگر بیٹی کا باپ ہونا کسی درجے میں بھی باعث شرم ہوتا تو کیا اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو بیٹیاں عطا کرتا؟ اُس وقت کے لوگوں نے تو طعنے دیے تھے جب حضور ﷺ کے صاحب زادے کا انتقال ہوا۔ کہا گیا کہ یہ ابتر ہو گئے ہیں‘ ان کی تو جڑ کٹ گئی۔ اب ان کا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اس پر پھر وہ وعید آئی:

﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳﴾ (الکوثر)

اے نبی ﷺ! ابتر تو یہ لوگ ہوں گے جو آپ کے دشمن ہیں۔ آپ کی تو معنوی اور روحانی اولاد اتنی ہوگی کہ وہ آسمان کے تاروں اور زمین میں ریت کے ذروں کی طرح گنی

نہ جا سکے گی۔ چنانچہ جن لوگوں نے طعنے دیے تھے‘ ان کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہا۔ حضورﷺ کی پوری زندگی شاہد ہے کہ بیٹیوں سے آپؐ کو جو محبت تھی‘ جو انس تھا‘ جس طرح شفقت کے ساتھ آپﷺ نے انہیں پالا ہے۔

عورت بحیثیت بیوی

عورت کی تیسری حیثیت بیوی ہونے کے اعتبار سے ہے۔ جس طرح والدہ اور والد کے درمیان حسن سلوک کا معاملہ ایک طرف اور قانون کا معاملہ دوسری طرف ہے‘ یہی معاملہ ہمیں شوہر اور بیوی کے درمیان اسلام کے عائلی نظام میں نظر آتا ہے۔ قانونی اعتبار سے مَرد کو غلبہ دیا گیا ہے۔ میں جان بوجھ کر لفظ حاکمیت استعمال کر رہا ہوں کہ اسے حاکم بنایا گیا ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ (النساء: ۳۴)

’’مَرد حاکم ہیں عورتوں پر۔‘‘

البتہ اخلاقی سطح پر اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کی انتہائی تاکید کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا:

((اَلدُّنْیَا مَتَاعٌ ، وَخَیْرُ مَتَاعِ الدُّنْیَا الْمَرْأَۃُ الصَّالِحَۃُ))

(صحیح مسلم: ۳۶۴۹)

’’دنیا متاع (کچھ وقت تک کے لیے فائدہ اٹھانے کی چیز) ہے‘ اور دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔‘‘

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں انسان کو عطا کی ہیں ان میں بہترین نعمت نیک عورت ہے۔ اگر مَردوں نے عورتوں پر ظلم روا رکھا ہے‘ زیادتی کی ہے‘ ان کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی ہے‘ ان کے اس قانونی تشخص کو کچلا ہے‘ ان کے اخلاقی حقوق جو اللہ نے دیے ہیں ان کی رعایت نہیں کی ہے اور اس کی وجہ سے اگر خواتین میں ردِّعمل پیدا ہوا تو اس برائی کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے ہاں ان لوگوں پر آئے گی کہ جو اس رویے کو اختیار نہیں کر رہے ہیں کہ جو شریعت نے دیا ہے۔

مَرد کی قوامیت

البتہ اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ جہاں تک قانونی حیثیت کا تعلق ہے‘ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ خاندان کے ادارے کو مستحکم کرنے کے لیے اسلام نے مَرد کی برتری اور اس کی قوامیت کو بڑے واشگاف الفاظ میں بیان کیا۔ اس سطح پر آ کر مَرد اور عورت ہرگز مساوی نہیں۔ ان کا مساوی ہونا عقل کے خلاف بھی ہے۔ اس لیے کہ خاندان کا ادارہ ایک انتظامی یونٹ ہے اور کسی بھی انتظامی یونٹ میں بالکل مساوی اختیارات والے دو سربراہ نہیں ہو سکتے۔ یہ ناممکن ہے۔ آپ پورے انسانی تمدن کا جائزہ لے لیجیے‘ کہیں چھوٹے سے چھوٹا ادارہ ایسا نہیں مل سکتا جس کے سربراہ دو ہوں اور وہ بالکل مساوی اختیارات والے ہوں۔ لہٰذا اگر تو یہ پیش نظر ہو جیسا کہ اسلام کا نظام چاہتا ہے کہ خاندان کے ادارے کو مستحکم کیا جائے‘ مضبوط بنایا جائے تو اس میں ایک کو برتری دینی ہو گی قانونی اعتبار سے‘ اختیارات کے اعتبار سے۔ اس کے بغیر وہ ادارہ مستحکم نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید اس کو واضح کرتا ہے کہ خاندان کے ادارے میں دو بنیادوں اور دو اساسات پر یہ برتری مَرد کو حاصل ہے:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ﴾
(البقرۃ:۲۲۸)

’’اور عورتوں کے لیے اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں دستور کے مطابق‘ اور مَردوں کے لیے ان پر ایک درجہ فوقیت کا ہے۔‘‘

جتنے کچھ ان کے اوپر مَردوں کے حقوق ہیں اسی کی مناسبت سے خواتین کے لیے بھی حقوق ہیں جو اللہ تعالیٰ نے معیّن کر دیے ہیں۔ خواتین کے حقوق اور فرائض کا ایک توازن ہے۔ لام آتا ہے کسی کے حق میں کوئی چیز اور علیٰ کسی کے خلاف جانے والی کوئی چیز۔ فرض کو تو تعبیر کیا جائے گا علیٰ سے کہ یہ فریضہ مجھ پر عائد ہوتا ہے‘ جبکہ میرا جو حق ہے یہ لام کے ساتھ آئے گا۔ ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ﴾ جیسے کچھ ان کے فرائض ہیں جو ان پر عائد کیے گئے ہیں‘ اسی کی مناسبت سے شریعت اسلامی نے ان کو حقوق عطا کیے ہیں

معروف طور پر۔ البتہ ایک اصول کے طور پر ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط﴾ ’’مَردوں کو ان پر ایک درجہ فضیلت کا حاصل ہے۔‘‘ یہ گویا کہ ڈائریکشن ہے‘ جیسے جوئے اور شراب کے بارے میں سورۃ البقرہ میں پہلا حکم آیا کہ یہ آپ سے جوئے اور شراب کے بارے میں پوچھ رہے ہیں تو آپ ان سے کہہ دیجیے کہ ان میں بہت بڑے گناہ کے پہلو میں اور کچھ منفعتیں بھی ہیں‘ لیکن ان کے گناہ کا پہلو ان کے منفعت والے پہلو سے بڑا ہے: ﴿وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (آیت ۲۱۹)۔ بات یہیں چھوڑ دی گئی‘ ابھی حرمت وغیرہ کی بات نہیں آئی۔ البتہ ایک سمت معین ہوگئی کہ ہوا کا رخ کیا ہے۔ اسی طریقے سے اس معاملے میں سورۃ البقرہ کی اس آیت میں ہوا کا رخ معین کر دیا گیا کہ جان لو مَردوں کو ان پر ایک درجہ فضیلت کا حاصل ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۳۲ میں یہ مضمون زیادہ واضح ہو کر آتا ہے اور ہمارے سامنے فضیلت کا ایک فلسفہ آتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ط لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ط وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ط وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿٣٢﴾﴾

’’اور تمنا نہ کیا کرو اُس شے کی جس کے ذریعے سے اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دے دی ہے۔ مَردوں کے لیے حصّہ ہے اُس میں سے جو وہ کمائیں گے‘ اور عورتوں کے لیے حصّہ ہے اُس میں سے جو وہ کمائیں گی۔ اور اللہ سے اُس کا فضل طلب کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت دے دی ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ یعنی یہ کہ اگر کسی کو کسی پہلو سے اللہ نے مجھ پر فضیلت دے دی ہے تو اب میں پیچ وتاب کھاؤں کہ یہ کیوں ہوا‘ مجھے اس کے برابر کیوں نہیں دیا گیا‘ اس کا حاصل کچھ نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ میری صلاحیتیں اور میرے اوقات ضائع ہوں گے۔ اگر اللہ نے تخلیق میں کسی کو کسی پر برتری دے دی ہے تو اس کو کھلے دل کے ساتھ قبول کیجیے‘ اس کے ساتھ reconcile کیجیے کہ ٹھیک ہے۔ مجھے جو کچھ دیا ہے‘ میرا محاسبہ اس کے اعتبار سے ہوگا۔ مجھے اپنی

آخرت سنوارنے کے اعتبار سے یہ سوچنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے دیا گیا ہے اس کے اعتبار سے میں نے اپنے فرائض ادا کیے کہ نہیں!

بہرحال اس فضیلت کو کوئی بھی انسان آسانی سے قبول نہیں کرتا۔ اگر مَردوں کی فضیلت عورتوں پر ہے تو بحیثیت مجموعی عورتوں کے اندر اس کے بارے میں ایک احساس پیدا ہونا فطری ہے۔ اس کا علاج بتایا جا رہا ہے کہ مَردوں کے لیے حصّہ ہے اس میں سے جو کمائی وہ کرتے ہیں اور عورتوں کے لیے حصّہ ہے اس میں سے جو کمائی وہ کرتی ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرو' یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ اُس نے اگر کسی کو کسی پر کوئی فضیلت دی ہے تو لاعلمی میں نہیں دے دی۔ ایسے ہی اٹکل پچو نہیں دے دی۔ وہ اپنے علم کامل کی بنیاد پر دی ہے' حکمت کاملہ کی بنیاد پر دی ہے۔ یہ بات آگے چل کر سورۃ النساء ہی کی آیت ۳۴ میں کھلتی ہے: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ ''مَرد حاکم ہیں عورتوں پر۔'' یہ قرآن کا اسلوب ہے۔ پہلے (آیت ۳۲ میں) تمہید ہے' ذہن کو تیار کیا جا رہا ہے کہ اللہ نے جس کو کسی پر فوقیت یا فضیلت دے دی ہے تو اس کو تسلیم کرنا چاہیے۔ اس پر کوئی شکوہ یا شکایت کی بجائے اسے تسلیم کر کے اپنے طرزِ عمل کو درست کیا جائے۔ اب (آیت ۳۴ میں) واضح کر دیا گیا کہ مَرد عورتوں پر قوام ہیں' ان پر نگران ہیں۔ قائم کہتے ہیں کھڑا' اس سے قوام' جیسے فاعل سے فعال' یہ مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس میں قائم سے بڑھ کر مبالغہ ہے یعنی نگران کی حیثیت سے کھڑا ہوا ہے یا حاکم کی حیثیت سے کھڑا ہوا ہے۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا کہ: ع ''نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مَرد!'' نگہبانی' نگرانی' حکمرانی کے سارے مفہوم ''قوام'' کے اندر شامل ہیں۔

اس قوامیت کی بنیاد کو بھی ساتھ ہی بیان کر دیا گیا: ﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ﴾ ''بسبب اُس فضیلت کے جو اللہ نے بعض کو بعض پر دی ہے۔'' ایک تو تخلیقی فضیلت ہے۔ مَردوں میں جسمانی قوت زیادہ ہے' توانائی زیادہ ہے' بھاگ دوڑ کی صلاحیت زیادہ ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے تخلیقی تفضیل ہے جو مَرد کو عطا کر دی گئی۔ ایک دوسری بنیاد اس کی یہ ہے کہ ﴿وَّ بِمَاۤ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ﴾ ''اور بسبب اس کے کہ

جو وہ خرچ کرتے ہیں اپنے مال۔’’ خرچ کرنے والا مَرد ہے۔ مہر مَرد دیتا ہے‘ عورت نہیں دیتی۔ نان نفقہ مَرد کے ذمہ ہے‘ عورت کے نہیں۔ خاندان کا کفیل مَرد ہے‘ عورت نہیں۔ چنانچہ یہ دو چیزیں ہوگئیں۔ ایک تو تخلیقی فضیلت ہے جو اللہ نے مَرد کو دی ہے۔ اور ایک جو عائلی نظام بنایا گیا ہے اس میں کمائی اور معاشی کفالت کا بوجھ مَرد پر ڈالا گیا ہے۔ لہٰذا ان دو بنیادوں پر مَرد کی قوامیت قائم ہے۔

اب نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ جو اللہ نے بنا دیا‘ جو اللہ نے مقام معین کر دیا اس کو قبول کیجیے‘ اس کے مطابق طرزِ عمل اختیار کیجیے۔ اس میں ہماری کامیابی ہے‘ دنیاوی بھی اور اُخروی بھی۔ عورت کے طرزِ عمل کو اسی آیت میں نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا:

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَیۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ؕ﴾

’’پس جو نیک بیویاں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں‘ غیب میں حفاظت کرنے والیاں اللہ کی حفاظت سے۔‘‘

اسلام کے نزدیک قابلِ تعریف کردار اس خاتون کا ہے جس میں دو وصف موجود ہوں۔ ایک شوہر کی فرماں برداری کہ اُس کا حکم مانے! وہ حاکم ہی کیا ہوا جس کا حکم نہ مانا جا رہا ہو۔ یہ ضرور ہے کہ حاکم مطلق صرف اللہ ہے‘ شوہر کا حکم اگر اللہ کے حکم کے خلاف ہے تو نہیں مانا جائے گا۔ اب یہاں معیّن ہو گیا کہ گھر میں حکومت مَرد کی ہے‘ شوہر کی ہے۔ دوسرے غیب کی پوری حفاظت کرنے والیاں۔ اس میں بڑی جامع بات آ گئی کہ اپنی عصمت کی حفاظت بھی۔ وہ درحقیقت صرف اس کی عصمت نہیں ہے بلکہ مَرد کی ناموس ہے۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی‘ یہ عصمت اس کی ذاتی ہے لیکن جب وہ ایک شخص کے ساتھ ازدواجی رشتے میں منسلک ہو گئی ہے تو یہ اضافی طور پر اُس مَرد کی عزت اور ناموس ہے۔ اسی طرح شوہر کے رازوں سے جس قدر بیوی واقف ہے کوئی اور واقف نہیں ہو سکتا۔ شوہر کی کمزوریوں کو جتنا بیوی جانتی ہے کوئی اور نہیں جان سکتا ہے۔ ایک صالح بیوی کا طرزِ عمل یہ ہو گا کہ وہ ان رازوں کو چھپائے‘ ان کی حفاظت کرے۔ اگر شوہر کے راز افشا کرتی ہے تو یہ اس طرزِ عمل کے منافی ہو گا جو ایک آئیڈیل بیوی کا قرآن مجید اور حدیثِ نبویؐ سے ہمارے سامنے آتا ہے۔

عُقدۃُ النِّکاح میں بھی فرق و تفاوت ہے۔ اس گرہ کے بندھنے میں عورت کی مرضی بھی یقیناً شامل ہے۔ عورت کی اجازت سے اس کا ولی ایجاب کرتا ہے' دولہا کو پیشکش کرتا ہے۔ مرد قبول کرتا ہے۔ اگر عورت کی مرضی نہیں ہے تو یہ بندھن نہیں بندھے گا۔ اس قانونی اختیار میں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ اگر لڑکی کنواری ہے تو اس کے سامنے ذکر کر دیا جائے اور وہ خاموش رہے تو خاموشی ہی اس کی اجازت شمار ہوگی۔ ہمارے ہاں عام بول چال میں کہا جاتا ہے۔ الخاموشی نیم رضا' حالانکہ خاموشی عربی کا لفظ نہیں ہے لیکن ''ال'' اس پر بھی لگاتے ہیں۔ یہ بہت ہی مضحکہ خیز صورت ہے۔ بہرحال خاموشی نیم رضا شمار ہوتی ہے۔ البتہ اگر وہ ثَیِّبہ ہے یعنی مطلقہ یا بیوہ ہے تو جب تک وہ صراحت کے ساتھ زبان سے نہ کہے بات پوری نہیں ہوگی۔ تاہم نکاح کی گرہ بندھ جانے کے بعد اب مَرد اور عورت کے درمیان معاملہ مساوی نہیں ہے۔ اب وہ گرہ مَرد کے ہاتھ میں ہے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ جب چاہے کھول دے' جب چاہے طلاق دے دے۔ اس پر اگر تحدید ہے تو اخلاقی ہے۔ اگر وہ بغیر کسی حقیقی سبب کے ایسا کر رہا ہے تو بہت بڑا ظلم کر رہا ہے۔ اللہ کے ہاں جواب دہی کرے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللّٰهِ تعالىٰ الطَّلَاق)) (سنن ابی داؤد) ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔'' قانون اپنی جگہ اور اخلاقی تعلیم اپنی جگہ' اس کو ذہن میں رکھیے۔

ان دونوں کے مابین توازن کی یہ تیسری مثال آج کی گفتگو میں آ گئی۔ اختیار مَرد کو حاصل ہے کہ وہ جب چاہے طلاق دے دے۔ اگر واقعتاً کوئی حقیقی سبب تھا تب تو معاملہ اور ہے لیکن اگر بلاسبب اس نے کسی عورت کی زندگی تباہ کی ہے تو وہ شخص اللہ کے ہاں بہت بڑا مجرم بن کر پیش ہوگا اور اس کی بہت سخت جواب دہی ہوگی۔ البتہ بیوی کو اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ جب چاہے اس گرہ کو کھول دے بلکہ وہ قاضی کے ذریعے سے خلع حاصل کر سکتی ہے' یا خاندان کے بزرگوں کے توسط سے ایک عورت اسباب پیش کر سکتی ہے کہ میں اس کے گھر میں نہیں بس سکتی۔ اس کو یہاں تک بھی اختیار دیا گیا ہے کہ مجرد اس وجہ سے کہ

اسے شوہر پسند نہیں ہے‘ خلع کی درخواست دے سکتی ہے۔ اس لیے کہ خاندانی نظام کے لیے جو بھی مودّت اور مزاج کی موافقت درکار ہے‘ اگر وہ نہیں ہے تو پھر یہ بندھن کیسے چلے گا۔ لہٰذا جیسے مَرد کی رغبت عورت کی طرف ہونی ضروری ہے ایسے ہی عورت کی رغبت بھی مَرد کی طرف ضروری ہے۔ لہٰذا یہ بھی خلع کا سبب بن سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عورت جب چاہے خود اس گرہ کو کھول دے بلکہ اسے کچھ بات اپنے بڑوں کو سمجھانی ہوگی۔ اگر ان کے سامنے واقعی یہ بات آجائے کہ عورت جذبات میں آکر ایسی بات نہیں کر رہی بلکہ واقعی کوئی سبب ہے تو خلع ہو جائے گا۔ طلاق اور خلع اپنے سٹیٹس کے اعتبار سے بالکل علیحدہ ہیں‘ ان کو مساوی نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں بھی ان کو مساوی کیا گیا ہے‘ اس سے رونما ہونے والا فساد دنیا کے اندر خوب جانا پہچانا ہے۔

ستر اور حجاب

تیسری چیز ہے ستر اور حجاب۔ ستر اور حجاب کے سلسلے میں اصل الاصول یہ ہے کہ ان کے بارے میں احکام سورۃ الاحزاب اور سورۃ النور میں آئے ہیں۔ ان دونوں سورتوں کے زمانہ نزول کو سامنے رکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ پہلا کون سا ہے‘ دوسرا کون سا۔ سورۃ الاحزاب غزوۂ احزاب کے دوران یا اس کے فوراً بعد نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد غزوۂ بنی مصطلق ہوا ہے‘ جس میں واقعہ افک پیش آیا ہے۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صِدّیقہ ؓ کا وہ ہار جو گم ہو گیا تھا‘ اس کا ذکر سورۃ النور میں ہے۔ سورۃ النور بعد میں نازل ہوئی اور سورۃ الاحزاب پہلے نازل ہوئی۔ سورۃ الاحزاب میں حجاب کے ابتدائی احکام ہیں جبکہ سورۃ النور میں ان کی تکمیل ہوگئی۔

سب سے پہلے ایک اصل الاصول سمجھ لیجیے۔ سورۃ الاحزاب میں ایک آیت آئی ہے جو سیرت کی تقاریر میں ہر ایک نے سنی ہوگی:

﴿لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾ (آیت ۲۱)

”(اے مسلمانو!) تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ) کی زندگی میں ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے۔“

اس کو دیکھو‘ اسے آئیڈیل بناؤ‘ اس کی پیروی کرو۔ اس کے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرو۔ یہ تمہارے لیے نمونہ ہے‘ اُسوۂ کاملہ ہے۔ یہاں غور کیجیے کہ مسلمان مَرد کے لیے تو ہر اعتبار سے مکمل نمونہ یقیناً حضورﷺ ہیں۔ مسلمان مَرد کی ایک حیثیت شوہر کی ہے‘ جس کے لیے بھی حضورﷺ کامل نمونہ ہیں۔ البتہ مسلمان خواتین کے لیے حضورﷺ کی زندگی مکمل نمونہ نہیں بن سکتی۔ بطور بیوی‘ بطور بیٹی جو اسوہ ہے‘ یہ حضورؐ کی زندگی میں نہیں ملے گا حالانکہ یہ بہت ضروری ہے۔ خواتین کے لیے بھی تو کوئی نمونہ ہونا چاہیے جس کو دیکھ کر وہ تاقیامِ قیامت اپنے طرزِ عمل کو معین کریں۔ حضورﷺ کی زندگی میں بعض پہلو خواتین کے لیے بھی یقیناً اسوہ ہیں۔ عبادت عورتوں کو بھی کرنی ہے تو وہ حضورﷺ کی زندگی میں عبادت کا نقشہ دیکھیں اور پیروی کریں۔ روزہ انہیں بھی رکھنا ہے تو حضورﷺ کی زندگی میں روزے کو دیکھیں اور اس کی پیروی کریں۔ البتہ جو مسائل اور معاملات خواتین کے لیے مخصوص ہیں ان کے لیے اسوہ کون ہوگا؟ اس سوال کو ذہن میں رکھیے۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ جس سورۂ مبارکہ میں یہ آیت آئی: ﴿لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾ اسی میں ازواجِ مطہرات سے خطاب ہو رہا ہے کہ درحقیقت اُمّت کی خواتین کے لیے ہمیشہ ہمیش کے لیے نمونہ انہیں بننا ہے۔ خاص طور پر وہ معاملات جو خواتین ہی کے ہیں‘ ان میں تو ظاہر ہے کہ نمونہ بننے والی ہو سکتی ہیں اُمّہات المومنین یعنی ازواج النبی رضی اللہ عنہن۔

میں نے یہ بات اس لیے بیان کی ہے کہ سورۃ الاحزاب میں احکام میں خطاب بظاہر حضورﷺ کی بیویوں سے ہے۔ یوں ہماری بعض بہنیں اس مغالطے میں مبتلا ہوگئی ہیں کہ یہ احکام صرف حضورﷺ کی بیویوں سے متعلق ہیں‘ یہاں عام مسلمان خواتین سے تو بات نہیں ہو رہی۔ یہ چیز ان کی غلط فہمی کا بہت بڑا سبب بن گئی۔ لہٰذا اس کو درست کرنا چاہیے۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو مسلمان خواتین کے لیے ان معاملات میں آئیڈیل بننا ہے جو مخصوص ہیں خواتین کے‘ ورنہ بحیثیتِ مجموعی آئیڈیل محمدٌ رسول اللہﷺ ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خطاب ہو رہا ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾

''اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیویو! تم عام عورتوں کے مانند نہیں ہو''

بلکہ تمہیں عام عورتوں کے لیے نمونہ بننا ہے۔ تمہیں چونکہ آئیڈیل بننا ہے' لہٰذا تمہارے لیے جو احکام دیے جا رہے ہیں وہ خصوصی ہیں۔ البتہ یہ کہ تمہیں اس پر اجر دہرا مل جائے گا' اور اگر تم نے کوئی کمی کی تو تمہاری سزا بھی دگنی ہو جائے گی۔ اس لیے کہ تمہاری لغزش تو بہت سی عورتوں کی لغزش کا سبب بن جائے گی۔ تمہاری عزیمت' تمہاری نیکی بہت سی خواتین کے لیے عزیمت اور نیکی کے راستے پر چلنے کا سبب بنے گی۔ لہٰذا تمہارا معاملہ مسلمان خواتین کے لیے اسوہ کا ہے۔ لہٰذا نوٹ کیجیے:

﴿اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾﴾

''اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو گفتگو میں نرمی پیدا نہ کرو کہ کسی لالچ میں پڑ جائے وہ شخص جس کے دل میں روگ ہے' اور بات کرو معروف انداز میں۔''

پہلی بات یہ فرمائی کہ اگر کسی سے گفتگو ہو رہی ہو تو اپنی آواز میں لوچ پیدا نہ کرو بلکہ آواز کرخت ہو۔ یہ نسوانی حسن کا ایک جزو ہے کہ آواز کے اندر بھی ایک جاذبیت ہے' کشش ہے۔ یہ اللہ نے کسی سبب سے رکھی ہے لیکن اگر کسی نامحرم کے ساتھ گفتگو کا موقع ہو رہا ہو تو وہاں حکم دیا جا رہا ہے کہ ذرا کرخت انداز میں گفتگو کرو' مبادا اس آواز کے لوچ کی وجہ سے وہ کوئی طمع اپنے دل کے اندر جگا لے۔ پھر فرمایا کہ بات بھی کرو تو بالکل صاف صاف واضح۔

﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾

''اور تم اپنے گھروں میں قرار پکڑو اور مت نکلو بن سنور کر پہلے دورِ جاہلیت کی طرح اور نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت پر کاربند رہو۔''

گھروں میں وقار کے ساتھ' سکینت کے ساتھ رہو۔ جیسے جاہلیت کے دور میں خواتین بن سنور کر نکلا کرتی تھیں' ایسے نہ نکلو۔ یہ ستر اور حجاب کے سلسلے میں پہلا حکم ہے جس

نے ڈائریکشن معین کر دی کہ عورت کا اصل مقام کیا ہے۔ ان کا اصل دائرۂ عمل‘ دائرۂ کار‘ تمدنی ذمہ داریوں کا اصل مقام گھر ہے۔ یہ ہے درحقیقت ان کے لیے اصل جگہ‘ نہ یہ کہ بازاروں میں جاؤ اور باہر نکلو۔ اگر کوئی ناگزیر تمدنی معاملہ ہے تو بات دوسری ہوگی‘ جس کے لیے آگے چل کر احکام دے دیے گئے۔ بغیر کسی حقیقی ضرورت کے مسلمان عورت گھر سے نہیں نکلے گی‘ گھر میں رہے گی۔ یہ پہلا directive principle ہو گیا۔ اس کے بعد آیت ۵۳ میں حکم دیا گیا:

﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ﴾

’’اور جب تمہیں ان (نبی ﷺ کی بیویوں) سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگا کرو۔‘‘

اب یہ مسلمان مَردوں کو حکم دیا جا رہا ہے اگر تمہیں نبی ﷺ کی بیویوں سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے اوٹ سے مانگو۔ بعض خواتین اخبارات میں لکھ رہی ہیں کہ حجاب کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ وہ نوٹ کریں کہ یہ لفظ حجاب آخر کس لیے آیا؟ پردے کی اوٹ میں ہونا کیا ظاہر کر رہا ہے اگر رُو در رُو ہونے میں‘ بے حجابانہ گفتگو کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے؟ نوٹ کیجیے کہ وہ امہات المومنین ہیں‘ ماؤں کے درجے میں۔ ان کے لیے حضورؐ کے انتقال کے بعد بھی کسی سے نکاح کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ آخری درجے میں اگر کوئی امکان ہو تو کم سے کم ایسا ہوگا کہ کسی کے دل میں کوئی برا خیال پیدا ہو‘ لیکن حکم دیا جا رہا ہے کہ ان سے بھی کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے اوٹ سے مانگو۔ مزید فرمایا:

﴿ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ﴾

’’(اے مسلمانو!) یہ طرزِ عمل زیادہ پاکیزہ ہے تمہارے دلوں کے لیے بھی اور اُنؓ کے دلوں کے لیے بھی۔‘‘

اللہ فاطر ہے‘ وہ فطرت جانتا ہے۔ ہم لاکھ پردے ڈالیں‘ ملمع سازی کریں اور تہذیب اور تمدن کے بہانے بنائیں لیکن ایک مَرد اور ایک عورت کے مابین جو فطری میلان رکھا گیا ہے‘ داعیہ ہے اسے فاطرِ فطرت سے بڑھ کر جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ یہ فرما رہا ہے کہ یہی تمہارے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ صحیح ہے اور ان کے لیے بھی۔

آگے آیت ۵۹ میں اس بات کو اور واضح کر دیا گیا کہ اگر مسلمان عورت کا اصل دائرۂ کار اس کا گھر ہے تو گھر سے باہر اگر نکلنا ہو تو کیا کرے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ﴾

’’اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کہہ دیجیے اپنی بیویوں سے اور اپنی بیٹیوں سے اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصّہ لٹکا لیا کریں۔‘‘

یہ ساری گفتگو اسی لیے ہو رہی تھی کہ تمام مسلمان خواتین کے لیے ہدایت مقصود ہے‘ اگرچہ اولین خطاب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج سے ہو رہا ہے۔ یہاں اس کو کھول دیا گیا۔ یہ ’’جلباب‘‘ کیا ہے‘ اسے اچھی طرح جان لیجیے۔ سورۃ النّور میں ایک لفظ آئے گا خُمُرِهِنَّ۔ یہ تو ہے دوپٹا کہ جو عورت گھر میں بھی پہنتی ہے۔ ایک بڑی چادر ہوتی تھی جس کو باہر پہنتی تھیں۔ جاہلیت کے دور میں کام کرنے والی کنیزوں اور لونڈیوں کا معاملہ اور تھا لیکن شریف گھرانوں کی خواتین جب باہر نکلتی تھیں تو ایک بڑی سی چادر اپنے پورے جسم کے گرد لپیٹ لیتی تھیں۔ ایامِ جاہلیت میں بھی یہ ان کے لباس کا جزو تھا۔ اس میں جو اضافہ کیا جا رہا ہے وہ یہ کہ ذرا اس کا ایک حصّہ اپنے چہروں پر لٹکا لیا کرو۔ یہاں سے چہرے کا وہ پردہ شروع ہوا جس کے بعد احادیث میں تفصیل آتی ہے کہ ازواجِ مطہرات اور مسلمان خواتین اس چادر کو یوں اوڑھتی تھیں کہ صرف ایک آنکھ کھلی رہ جاتی تھی‘ باقی پورے کا پورا چہرہ ڈھک جاتا تھا۔ شاید پہلے بھی اس کا رواج ہو لیکن میں نے اس دور میں یہ دیکھا ہے کہ ایرانی خواتین میں کم سے کم یہ چیز بتمام وکمال موجود ہے۔ چادر‘ جو ان کے تقریباً ٹخنوں تک یا ذرا سی اونچی پنڈلی اور ٹخنے کے درمیان تک آئی ہوتی ہے‘ وہ پورے جسم کو اس طرح ڈھانپتی ہے کہ مجال نہیں کہ جسم کا کوئی حصّہ نظر آ جائے۔ چہرے پر بھی وہ اس کو اس طریقے سے پکڑتی ہیں کہ ایک آنکھ کھلی رہ جاتی ہے جس سے وہ راستہ دیکھ لیں‘ باقی پورا چہرہ ڈھکا ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ صحیح منشا ہے ان الفاظ کا: ﴿یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ﴾ کہ وہ اپنی چادروں کے پلّو اپنے چہروں پر لٹکا لیا کریں۔ یہ پردے کا پہلا

حکم ہوا گھر سے باہر نکلنے میں۔

یہ مضمون سورۃ النّور میں جا کر مکمل ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ گھر میں رہتے ہوئے مسلمان خاتون کے لیے کیا حکم ہے؟ سورۃ النور کا پردہ' اس کے احکام گھر کے اندر کے پردے کے لیے ہیں۔ ایک ہے گھر سے باہر کا پردہ' جو جلباب ہے' چادر ہے اور اس کو چہرے کے آگے لٹکا کر نکلنا ہے۔ ایک ہے گھر میں کیا کرنا ہے۔ اس ضمن میں فرمایا:

﴿قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ ؕ ذٰلِكَ اَزۡكٰى لَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيۡرٌۢ بِمَا يَصۡنَعُوۡنَ ۝۳۰﴾

''(اے نبی ﷺ!) مؤمنین سے کہیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ یقیناً اللہ باخبر ہے اُس سے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔''

﴿وَقُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنٰتِ يَغۡضُضۡنَ مِنۡ اَبۡصَارِهِنَّ وَيَحۡفَظۡنَ فُرُوۡجَهُنَّ وَلَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَلۡيَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوۡبِهِنَّ ۠﴾

''اور مؤمن عورتوں سے بھی کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں' اور وہ اپنی زینت کا اظہار نہ کریں' سوائے اس کے جو اس میں سے از خود ظاہر ہو جائے' اور چاہیے کہ وہ اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکّل مار لیا کریں۔''

اب اس کو جن لوگوں نے سمجھا ہے کہ یہ سڑک پر چلتے ہوئے نیچے رکھنے کا حکم ہے' تو یہ ہے اصل میں اس مغالطے کی بنیاد۔ سڑک پر چلتے ہوئے تو وہ معاملہ آ رہا ہے کہ اپنی جلباب میں لپٹ کر نکلو اور چہرے کو چھپا کر نکلو بلکہ اس کے آگے بھی ڈالو اس چادر کو۔ نگاہیں نیچی رکھنا گھر کے اندر کی بات ہے۔ دوسرا حکم دیا گیا کہ اپنی اوڑھنیوں کے بکل اپنے سینوں پر مار لیا کریں۔ گھر میں رہتے ہوئے بھی یہ چیز پسندیدہ نہیں ہے کہ ایک نوجوان مسلمان لڑکی کا سینہ بالکل کھلا ہوا ہو' کپڑے بھی اس کے تنگ ہوں اور وہ گھوم رہی ہو۔ بھائیوں کے سامنے بھی اس کی اجازت نہیں' بلکہ یہ ہے کہ اس کا لباس بھی ساتر ہو۔ اس کا پورا جسم ستر ہے سوائے ہاتھ' چہرے اور پاؤں کے۔ باقی پورا جسم تو ہر حال میں ڈھکا رہنا ہے۔ ان تین

حصوں کے سوا کسی باپ کو بھی اپنی بیٹی کے جسم کا کوئی حصّہ دیکھنا جائز نہیں‘ کسی بھائی کو اپنے بہن کے جسم کا کوئی حصّہ دیکھنا جائز نہیں۔ یہ ستر کہلاتا ہے۔ مَرد کا ستر ناف سے گھٹنے کے نیچے تک ہے جبکہ عورت کا ستر اُس کا پورا جسم ہے سوائے چہرے‘ ہاتھ اور پاؤں کے۔ وہ ہمیشہ ڈھکا ہوا رہنا چاہیے۔ جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں وہ بھی تنگ نہ ہوں‘ باریک نہ ہوں۔ ان میں جسم کے خدوخال نمایاں نہ ہوں۔ سینے کا ابھار تو کتنا ہی کھلا کپڑا پہن لیں‘ نہیں چھپے گا۔ چنانچہ اس کے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنے سینوں پر‘ اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکل مار لیا کریں۔

﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ﴾

’’اور وہ ظاہر نہ کریں اپنی زینت کو (کسی پر) سوائے اپنے شوہروں کے‘ یا اپنے باپوں کے‘ یا اپنے شوہروں کے باپوں کے‘ یا اپنے بیٹوں کے‘ یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے‘ یا اپنے بھائیوں کے‘ یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں (بھتیجوں) کے‘ یا اپنی بہنوں کے بیٹوں (بھانجوں) کے‘ یا اپنی (جان پہچان کی) عورتوں کے‘ یا اُن کے جن کے مالک ہیں ان کے داہنے ہاتھ‘ یا ایسے زیردست مَردوں کے جو اس طرح کی غرض نہیں رکھتے‘ یا اُن لڑکوں کے جو عورتوں کے مخفی معاملات سے ابھی ناواقف ہیں۔‘‘

ایک عورت کی یہ جو زینت ہے وہ گھر میں ہے۔ لباس اُس نے پورا پہنا ہوا ہے‘ پھر بھی اُس کا چہرہ اور اُس کے ہاتھ کھلے ہیں۔ اُس نے اوڑھنی اوڑھی ہوئی ہے‘ پھر بھی اس کا ایک نسوانی وجود ہے۔ اس زینت میں سے جو حصّہ ازخود ظاہر ہو رہا ہے‘ ایک عورت اس کو کیسے چھپائے گی؟ چنانچہ یہاں تفصیل بیان کر دی گئی کہ یہ محرم ہیں‘ ان کے سامنے عورت ستر کے ساتھ آ سکتی ہے۔ ستر اس کا پورا ہو‘ پورا جسم ڈھکا ہوا ہو تو وہ کھلے چہرے کے ساتھ محرم کے سامنے آ جائے گی۔ وہ محرم یہ ہیں: ان کے شوہر‘ ان کے والد یا ان کے شوہروں

کے والد‘ یا اُن کے اپنے بیٹے یا ان کے شوہروں کے بیٹے یعنی سوتیلے بیٹے‘ یا ان کے بھائی یا ان کے بھائیوں کے بیٹے‘ یا اُن کی بہنوں کے بیٹے‘ یا اُن کی وہ خواتین جو گھروں میں آنے جانے والی ہیں‘ یا ان کی لونڈیاں‘ یا وہ ملازم جو اتنے زیردست ہوتے ہیں کہ کوئی امکان نہیں ہوتا کہ وہ گھر والوں کے بارے میں کوئی بھی خیال اپنے دل میں لاسکیں‘ یا وہ بچے جو ابھی عورتوں کے معاملات سے واقف نہیں ہیں۔ یہ تفصیل ہے محارم کی کہ عورت نے اپنے جسم کو پورے ستر میں ڈھانپا ہوا ہو تو ان کے سامنے آجائے گی‘ اگرچہ اس کی کچھ نہ کچھ زینت ظاہر ہو رہی ہو۔ اس کا پورا وجود ہی ایک زینت ہے‘ جو چھپ نہیں سکتی۔ البتہ جب باہر نکلے گی تو نامحرم سے پردہ ہے۔ اب وہ اپنی چادر اپنے جسم کے گرد پوری لپیٹ کر اور صرف ایک آنکھ کھلی ہوئی یا اتنا کہ جس سے وہ راستہ دیکھ سکے‘ اس طریقے سے مستور ہو کر نکلے گی۔

ایک مغالطہ کا ازالہ

باہر کا پردہ سورۃ الاحزاب میں دیکھیے اور گھر کے اندر کا پردہ سورۃ النور میں۔ اگر کوئی ارادہ ہے اللہ کی کتاب کی پیروی کا‘ اللہ کی شریعت کو ماننے کا تب تو یہ ہیں قرآن وحدیث کی ہدایات۔ اس سلسلے میں ایک حدیث آپ کو سنا دینا چاہتا ہوں‘ اس لیے کہ ایک بڑا مغالطہ یہ ہے کہ خواتین جنگوں میں شامل ہوتی رہی ہیں۔ یہ معاملہ بھی اصل میں اس طرح مغالطہ کا باعث ہو جاتا ہے کہ حجاب کے احکام تدریجاً آئے ہیں۔ غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد پہلے ہوئے‘ پھر غزوۂ خندق ہے۔ سورۃ الاحزاب غزوۂ خندق کے بعد نازل ہو رہی ہے۔ چنانچہ ان تینوں غزوات کے دوران خواتین کا طرزِعمل آیاتِ حجاب کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے اگر کوئی واقعہ ہے تو وہ دلیل نہیں بنے گا‘ اس لیے کہ ابھی تو پردے کے احکام آئے نہیں۔ اس کے بعد غزوۂ خیبر کا ایک واقعہ ہے جو میں آپ کو سنا دیتا ہوں تاکہ مسلمان خواتین خدا کے لیے غور کریں کہ جو دلیلیں وہ لے آتی ہیں وہ کس طور سے غلط ہیں اور ان کو بھی نہ سمجھنا اصل میں مغالطے کی بنیاد بن رہا ہے۔

حشرج بن زیادؒ اپنی دادی سے یہ واقعہ نقل کر رہے ہیں۔ وہ فرماتی ہیں:

أَنَّهَا خَرَجَتْ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي غَزْوَةِ خَيْبَرَ

سَادِسَ سِتِّ نِسْوَةٍ ، فَبَلَغَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَبَعَثَ إِلَيْنَا فَجِئْنَا فَرَأَيْنَا فِيهِ الْغَضَبَ فَقَالَ :((مَعَ مَنْ خَرَجْتُنَّ وَبِإِذْنِ مَنْ خَرَجْتُنَّ؟)) فَقُلْنَا : يَا رَسُولَ اللّٰهِ خَرَجْنَا نَغْزِلُ الشَّعَرَ وَنُعِينُ بِهِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَعَنَا دَوَاءُ الْجَرْحَى وَنُنَاوِلُ السِّهَامَ وَنَسْقِي السَّوِيقَ، فَقَالَ :((قُمْنَ)). حَتَّى إِذَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ خَيْبَرَ أَسْهَمَ لَنَا كَمَا أَسْهَمَ لِلرِّجَالِ، قَالَ : قُلْتُ لَهَا : يَا جَدَّةُ وَمَا كَانَ ذٰلِكَ قَالَتْ : تَمْرًا. (رواه احمد و ابوداؤد)

’’وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خیبر کی جنگ میں نکلیں‘ یہ چھ عورتوں میں سے چھٹی تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ بات پہنچی تو آپ نے ہمیں بلا بھیجا‘ ہم آئے تو ہم نے آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر غصے کے آثار دیکھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ’’تم کس کے ساتھ نکلیں؟ اور کس کے حکم سے نکلیں؟‘‘ ہم نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! ہم چلی آئی ہیں‘ ہم اون کاتیں گی اور اس سے اللہ کی راہ میں مدد پہنچائیں گی۔ ہمارے پاس کچھ مرہم پٹی کا سامان بھی ہے‘ ہم مجاہدین کو تیر پکڑا دیں گی اور ستو گھول کر پلائیں گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’چلو واپس جاؤ۔‘‘ پھر جب اللہ تعالیٰ نے خیبر فتح کرا دیا تو آپؐ نے ہمیں مَردوں کی طرح حصّہ دیا۔ حشرج بن زیاد کہتے ہیں: مَیں نے ان سے پوچھا: دادی! وہ حصّہ کیا تھا؟ تو وہ کہنے لگیں: کچھ کھجوریں تھیں۔‘‘

یہ حدیث واضح طور پر یہ بات سامنے لا رہی ہے کہ یہ پورا استدلال اگر کسی سابقہ غزوے کے واقعے سے کیا جا رہا ہو تو انہیں جان لینا چاہیے کہ قرآن مجید میں جب تک شراب کی آخری حرمت نہیں آئی تو لوگ شراب پیتے رہے۔ کیا اس سے دلیل لائیں گے شراب کے حلال ہونے پر؟ جب تک سود کا آخری حکم نہیں ہوا اور سود کا لین دین جاری رہا تو کیا اس سے سود کے حلال ہونے کے لیے دلیل آئے گی؟ اس میں دیکھنا پڑے گا کہ احکام تدریجاً آئے ہیں اور جب دین مکمل ہوا:

﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ﴾

’’آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے اور تم پر اِتمام فرما دیا ہے اپنی نعمت کا اور تمہارے لیے مَیں نے پسند کر لیا ہے اسلام کو بحیثیت دین کے۔‘‘

تو یہ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا آخری زمانہ ہے۔ ہمیں اُس وقت کی ہدایات مدّ ِنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک دین کی اہم ترین چیز نماز ہے۔ مسلمان عورت پر نمازِ باجماعت فرض نہیں ہے۔ مسلمان عورت کو ترغیب یہ ہے کہ وہ گھر میں نماز ادا کرے۔ ہمارے کچھ مفتیانِ کرام جو اِس وقت خواتین کو اجازت دے رہے ہیں کہ وہ دفتروں میں کام کر سکتی ہیں، انہی سے اگر آپ فتویٰ لیں گے کہ کیا عورت مسجد میں آ کر نماز پڑھ سکتی ہے تو آپ خود دیکھیے کہ ان کا فتویٰ کیا ہو گا۔ ان کا تضاد اس وقت بہت نمایاں ہو کر آ رہا ہے جو گروہی یا سیاسی مصلحتوں کی خاطر ایسا کہہ رہے ہیں۔ بقول اقبال: ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

وہ مسجدوں میں عورت کا آنا گوارا نہیں کرتے لیکن دفتروں میں عورت کے جانے کے لیے رخصت دے رہے ہیں کہ کوئی قباحت نہیں۔ ع ’’ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!‘‘ خواتین کے لیے نماز کے بارے میں حضور ﷺ کی واضح تاکید ہے کہ ان کے مسجد میں نماز پڑھنے سے گھر میں پڑھنا افضل ہے۔ گھر کے صحن سے گھر کے دالان میں پڑھیں تو وہ بہتر ہے۔ دالان کی نسبت کمرے میں پڑھیں تو اس سے بہتر ہے۔ کمرے سے آگے بھی کوئی اندرونی کوٹھڑی ہو وہاں پڑھیں تو اور بہتر۔ یہ ہے ایک ترتیب۔ پنجگانہ نماز جو فرض ہے اس میں ان کا آنا قطعاً ضروری نہیں۔ البتہ جمعہ اور عیدین کا معاملہ ذرا مختلف ہو گا۔ اگرچہ ہمارے اکثر مفتی حضرات اس میں بھی اجازت نہیں دیتے لیکن اس میں سوچا جا سکتا ہے کہ چونکہ خطبہ ہوتا ہے، تعلیم اور تلقین کا معاملہ ہے، مسلمان خواتین کو بھی اس کی ضرورت ہے۔ البتہ عام نمازوں میں تو ہمارے ہاں خواتین نہیں آتیں۔ کیوں نہیں آتیں؟

سوچیے دین کا مزاج کیا ہے۔

اگر کسی مسلمان عورت کو واقعتاً کوئی مجبوری ہو جائے تو میں بھی اس بات کی اجازت دوں گا کہ وہ کام کرے ۔ اوّل تو باہر نکل کر کام کر رہی ہے تو ستر اور حجاب کے پورے احکام کو ملحوظ رکھ کر کام کرے۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسا ذریعہ معاش تلاش کرے جو گھر میں رہ کر اختیار کیا جا سکتا ہو۔ کیا ہی اچھا ہو اگر حکومتی سطح پر یہ پالیسی طے ہو جائے! آخر ایک اسلامی ملک میں جو حکومت قائم ہوتی ہے' اسلامی احکام کا نفاذ اس کے فرائض میں شامل ہے۔ اس میں صورت یہ ہو کہ ایسی کاٹیج انڈسٹریز کا بندوبست کیا جائے جہاں خواتین گھروں میں رہتے ہوئے ملک کے معاشی استحکام میں حصّہ ڈال سکیں۔ اگر حکومت کی طرف سے یہ پالیسی بن جائے تو پورا نظام بن سکتا ہے۔ اس کا اہتمام ہو سکتا ہے کہ مَردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرنا نہ ہو بلکہ خواتین کے علیحدہ ادارے بنا دیے جائیں جہاں وہ کام کریں' یا گھروں میں رہ کر کام کریں۔ اگر مجبوراً کوئی معاملہ ہے تو عورت نکلے مگر ستر اور حجاب کے ساتھ۔

پھر دیہات کی خواتین کے بارے میں دلیل دی گئی ۔ اس میں جو زمین آسمان کا فرق ہے اس کو لوگ نوٹ نہیں کر رہے ۔ بحثا بحثی اور ضدم ضدا میں ہر چیز نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اول تو یہ نوٹ کیجیے کہ اکثر خواتین جو دیہات میں کام کرتی ہیں کیا وہ نامحرموں کے ساتھ کام کرتی ہیں؟ اگر وہ کھیت پر روٹی لے کر گئی ہیں تو کس کے لیے؟ باپ کے لیے' بھائی کے لیے' بیٹے کے لیے' شوہر کے لیے۔ اپنے کھیت میں اگر وہ کام کر رہی ہے تو کیا وہاں ان کے ساتھ نامحرم کام کر رہے ہیں؟ یا اپنے گھر میں اپنے ڈھور ڈنگروں کو دیکھ رہی ہیں تو وہاں بھی نامحرموں کے ساتھ معاملہ نہیں ہے ۔ پھر یہ کہ ہمارے دفتروں کا جو ماحول ہے جس میں زیب و زینت سے بننا سنورنا اگر نہ بھی ہو تب بھی یہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ مرد کے لیے کشش رکھتی ہے ۔ کیا دیہات میں کام کرنے والی خواتین اور ان میں کوئی نسبت ہے؟ یہ فرق و تفاوت سامنے رکھیے۔ زمین آسمان کا فرق ہے!

آخری بات میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے ہاں دیہات میں اگر کوئی چیز غلط ہو رہی ہو تو کیا اس کو سامنے رکھ کر آپ دین کو بدل دیں گے؟ دیہات میں اگر غلط رسومات

ہیں تو ہمیں ان کی اصلاح کرنی ہے نہ کہ ان کو دلیل بنا کر ہم ان رسومات کو عام کر دیں۔ وہاں بھی اگر ستر اور حجاب کے احکام کی پابندی نہیں ہو رہی تو کرنے کی ضرورت ہے‘ بجائے اس کے کہ وہاں سے دلیل یہاں کے لیے لائیں۔ اگر وہاں کوئی کمی نظر آ رہی ہے تو اس کمی کو پورا کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ ہمارا امام قرآن ہے‘ ہمارے لیے حاکم قرآن ہے۔ ہمارے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکام واجب العمل ہیں‘ نہ کہ ہمارے دیہات کا ماحول دلیل و برہان ہے۔

میں نے عرب میں بدو خواتین کو دیکھا ہے۔ وہاں شہروں میں تو جو پردہ اس وقت رائج ہے وہ حکومت کا جبری نافذ کردہ ایک برقع ہے۔ اس برقعے کے اندر ستر بھی نہیں ہے‘ معاملہ بہت ہی خراب ہے۔ البتہ دین کی رمق عرب کے دیہات میں جا کر اب بھی دیکھ لیجیے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اونٹوں کی ڈار لے کر کوئی خاتون جا رہی ہے یا بھیڑ بکریوں کا گلہ ہے‘ ہاتھ میں ڈنڈا لیے ہوئے چرواہے کے فرائض ادا کر رہی ہے لیکن پورا جسم برقع کے اندر ہے۔ ہاتھوں پر دستانے ہیں‘ پاؤں پر جرابیں ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ اس کے جسم کا کوئی حصّہ آپ کو نظر آ جائے۔ اگر وہاں کی عورت یہ کام کر سکتی ہے‘ ڈھور ڈنگروں کی دیکھ بھال کر سکتی ہے‘ پانی پلا کر لا سکتی ہے‘ انہیں چرانے کے لیے جنگل میں لے جا سکتی ہے اور اپنے سترِ و حجاب کا پورا لحاظ کر سکتی ہے تو ہمارے دیہات کی خواتین کیوں نہیں کر سکتیں؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس علم کو عام کیا جائے‘ پھیلایا جائے۔ دین کی اصل تعلیمات کو لوگوں تک پہنچایا جائے۔ ساری کمی اصل میں اس کی ہو رہی ہے اور اسی کی کسی ادنیٰ درجے میں تلافی کی ایک کوشش میں نے آج کی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی راہِ ہدایت دکھائے اور ہدایت کو ذہناً اور عملاً قبول کرنے کی توفیق دے اور ہمارے تمام بھائیوں اور تمام بہنوں کو اس بات کی توفیق دے کہ وہ دین کو اپنے پیچھے لگانے کے بجائے خود دین کی پیروی کا عزمِ مصمّم کر لیں۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(۱۹۸۲ء میں کیا گیا ایک خطاب)

❁❁❁

اسرائیلی مظالم اور فلسطین و لبنان کی حالت

ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر محمد طیب خان سنگھانوی☆

فلسطین اور لبنان میں جاری اسرائیلی جارحیت ایک طویل المیعاد مسئلہ ہے جو کئی دہائیوں سے مشرقِ وسطیٰ کے امن کو داؤ پر لگا چکا ہے۔ اسرائیل کی جانب سے فلسطینی علاقوں خاص طور پر غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے پر مسلسل بمباری، انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں، گھروں کی مسماری، بچوں اور عورتوں کی ہلاکتیں، اور بنیادی سہولیات کی تباہی عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ چکی ہیں۔ لبنان، جو بارہا اسرائیلی حملوں کا نشانہ بنا ہے، اپنی بقا کے لیے سیاسی و عسکری مزاحمت کی راہ پر گامزن ہے۔

فلسطین کا تاریخی پس منظر

فلسطین کا مسئلہ صرف زمینی تنازع نہیں بلکہ ایک قوم کی شناخت، بقا، اور آزادی کی جنگ ہے۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کے ساتھ ہی لاکھوں فلسطینی بے گھر ہو گئے، جنہیں آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں پناہ گزینوں کی حیثیت سے زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ کی جانب سے فلسطین کی تقسیم کا منصوبہ (UN Partition Plan) پیش کیا گیا، جس کے تحت فلسطین کو دو ریاستوں میں تقسیم کیا جانا تھا: ایک یہودی ریاست اور ایک عرب ریاست۔ عرب ممالک اور فلسطینیوں نے اس تقسیم کو غیر منصفانہ قرار دے کر مسترد کر دیا، جس کے نتیجے میں ۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل جنگ ہوئی۔ اسرائیل نے اس جنگ میں نہ صرف اپنے لیے مختص زمین پر قبضہ کیا بلکہ اضافی عرب علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا، جسے فلسطینی ’’نکبہ‘‘ یعنی تباہی کہتے ہیں۔

☆قلم کار، روزنامہ ایکسپریس و جنگ، کراچی

غزہ کی پٹی: ایک کھلی جیل

غزہ کی پٹی ۲۰۰۶ء سے اسرائیلی ناکہ بندی کا شکار ہے‘ جس کے باعث یہاں بنیادی ضروریاتِ زندگی جیسے خوراک‘ پانی‘ ادویات‘ بجلی‘ اور تعلیمی وسائل کی شدید کمی ہے۔ اسرائیل ہر چند سال بعد غزہ پر بڑی فوجی کارروائیاں کرتا ہے‘ جن میں ہزاروں فلسطینی شہید ہو چکے ہیں۔ ۲۰۰۳ء سے ۲۰۲۴ء کے دوران اسرائیل کی بمباری سے غزہ میں ہسپتال‘ اسکول‘ رہائشی عمارات‘ اور پناہ گزین کیمپ تباہ کیے گئے۔ ۷ اکتوبر ۲۰۲۳ء سے جاری اسرائیلی جارحیت میں شہداء کی مجموعی تعداد پچاس ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ (جن میں ۶۰ فیصد بچے اور عورتیں شامل ہیں)‘ ۱۱۵۰۰۰ سے زائد زخمی‘ تقریباً ۵ ملین افراد بے گھر‘ جبکہ ۹۰ فیصد سے زائد عمارات تباہ ہوگئیں۔

ان اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ اسرائیل کی کارروائیاں صرف عسکری نہیں بلکہ عام شہریوں کو ہدف بنانے کے مترادف ہیں‘ جو بین الاقوامی قانون کے مطابق جنگی جرائم کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ افسوس صد افسوس‘ سال رواں کے ماہ رمضان المبارک میں بھی معصوم فلسطینی و لبنانی اپنے پیاروں کی لاشیں اٹھاتے رہے جبکہ تمام عالمِ اسلام خاموش تماشائی بنا رہا۔ تباہی و بربادی کا یہ سفاکانہ کھیل جاری ہے اور اس ضمن میں مسلم اُمّہ کا قابل ذکر کردار کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔

مغربی کنارے کی صورتِ حال

مغربی کنارے میں اسرائیلی فوجی چوکیاں‘ غیر قانونی بستیوں کی تعمیر‘ فلسطینیوں کی زمینوں پر قبضہ‘ اور نقل و حرکت پر پابندیاں معمول بن چکی ہیں۔ مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی‘ نمازیوں پر حملے اور پُرامن مظاہرین پر گولیاں چلانا روز مرہ کا عمل ہے۔ ۲۰۲۴ء میں مغربی کنارے میں اسرائیلی بستیوں کی تعمیر نے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے‘ جبکہ فلسطینی کسانوں‘ طلبہ‘ اور صحافیوں کو آئے روز گرفتار یا شہید کیا جاتا رہا۔ یہ سب انسانی حقوق کی کھلم کھلا خلاف ورزیاں ہیں۔

لبنان میں اسرائیلی مظالم

لبنان خصوصاً جنوبی لبنان‘ اسرائیلی جارحیت کا مستقل نشانہ رہا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں اسرائیلی

افواج نے بیروت پر حملہ کیا اور ہزاروں شہریوں کو نشانہ بنایا۔ صابرا اور شتیلا کے مہاجر کیمپوں میں قتلِ عام تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ ۲۰۰۶ء کی جنگ میں اسرائیل نے حزب اللہ کے خلاف کارروائی کے نام پر لبنان کے انفراسٹرکچر کو تباہ کر دیا۔ اسکول، ہسپتال، پل، سڑکیں اور بجلی گھر ملبے کا ڈھیر بن گئے۔ حالیہ مہینوں میں جنوبی لبنان ایک بار پھر حملوں کی زد میں ہے اور کئی دیہات خالی کروائے جا چکے ہیں۔

انسانی بحران اور بین الاقوامی ردِّعمل

فلسطین اور لبنان میں جاری اسرائیلی مظالم نے انسانی بحران کو جنم دیا ہے۔ لاکھوں افراد مہاجر کیمپوں میں مقیم ہیں۔ غذائی قلت، ادویات کی عدم دستیابی اور بیماریوں کا پھیلاؤ عام ہے۔ بچوں کی تعلیم، عورتوں کی صحت اور نوجوانوں کا مستقبل شدید خطرے میں ہے۔ اقوامِ متحدہ، ایمنسٹی انٹرنیشنل، اور دیگر ادارے متعدد بار اسرائیل کو تنبیہہ کر چکے ہیں، مگر کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ مغربی دنیا خصوصاً امریکہ اور برطانیہ اسرائیل کی حمایت جاری رکھے ہوئے ہیں، جبکہ مسلم دنیا کی اکثریت محض بیانات تک محدود ہے۔

بین الاقوامی قوانین اور اسرائیلی خلاف ورزیاں

بین الاقوامی قوانین کے تحت شہریوں کو جنگ کے دوران تحفظ حاصل ہوتا ہے، جن میں درج ذیل ضوابط شامل ہیں:

جنیوا کنونشنز (۱۹۴۹ء)، اقوامِ متحدہ کا چارٹر، انسانی حقوق کا عالمی منشور

ان قوانین کے مطابق کسی بھی ریاست کو شہری آبادی پر بمباری کی اجازت نہیں۔ بنیادی ضروریات جیسے پانی، بجلی، اور صحت کی تنصیبات کو تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ بچوں اور خواتین کو خصوصی تحفظ حاصل ہے۔ اسرائیل نے ان تمام قوانین کی خلاف ورزی کی ہے، مگر کوئی سزا یا مؤثر پابندی نہیں لگائی گئی، جو بین الاقوامی نظام کی ناکامی کو ظاہر کرتی ہے۔

مسلم دنیا کا کردار

مسلم ممالک کی تنظیم OIC (آرگنائزیشن آف اسلامک کوآپریشن) محض قرار دادیں منظور کرنے اور بیانات دینے تک محدود ہے۔ فلسطین اور لبنان کی حمایت کے لیے عملی اقدامات

(جیسے اسرائیل کے خلاف سفارتی و معاشی بائیکاٹ‘ فلسطینیوں کی مالی وطبی امداد‘ اقوامِ متحدہ میں اسرائیل کے خلاف مؤثر قرار دادیں لانا) نظر نہیں آتے۔ پاکستان‘ ترکی‘ ایران‘ ملائشیا اور قطر نے کچھ حد تک آواز بلند کی ہے‘ مگر باقی دنیا خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔

جہادِ فلسطین کا فتویٰ: سلفیہ کا ردِّعمل

دعوہ سلفیہ کے رہنما ڈاکٹر یاسر برہامی نے انٹرنیشنل یونین آف مسلم سکالرز کی طرف سے جاری کردہ فتویٰ پر ردعمل دیتے ہوئے کہا ہے کہ اہلِ غزہ نے جنگ شروع کرنے سے پہلے مشورہ نہیں کیا۔ وہ صرف ایران کو اعتماد میں لے کر جنگ میں کود گئے‘ حالانکہ انھیں دیگر اسلامی ملکوں سے بھی بات کرنی چاہیے تھی تاکہ وہ یہودیوں سے کیے گئے معاہدے کو ختم کر کے جنگ میں شریک ہوجاتے۔ فی الحال اسلامی ممالک معاہدے کے پابند ہیں اور اگر معاہدہ ختم کرنے تک بات گئی تو جنگ صرف اسرائیل کے ساتھ نہیں ہوگی بلکہ امریکہ اور اس کے حواری بھی مدِمقابل ہوں گے۔ انہوں نے قرآنی آیت:

﴿وَاِنِ اسۡتَنۡصَرُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ فَعَلَيۡكُمُ النَّصۡرُ اِلَّا عَلٰى قَوۡمٍۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ ؕ﴾ (الانفال:۷۲)

’’اگر وہ تم سے دین کے معاملے میں مدد مانگیں تو اُن کی مدد کرنا تم پر واجب ہے‘ مگر کسی ایسی قوم کے خلاف (نہیں) کہ اُن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو۔‘‘

کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ دینی بھائیوں کی مدد صرف اس قوم کے خلاف کرنے کا حکم ہے جس کے ساتھ معاہدہ نہ ہوا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ فرعون نے اسّی ہزار بچے قتل کر دیے تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہی کہا تھا کہ ﴿اسۡتَعِيۡنُوۡا بِاللّٰهِ وَاصۡبِرُوۡا ۚ﴾ (الاعراف:۱۲۸) ’’اللہ سے مدد مانگتے رہو اور صبر کا مظاہرہ کرو‘‘ کیونکہ ان کے پاس طاقت نہیں تھی۔ ڈاکٹر یاسر برہامی نے سورۃ الکہف میں مذکور حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ حضرت خضر نے حضرت موسیٰؑ سے یہ نہیں کہا تھا کہ آؤ ظالم بادشاہ کا مقابلہ کریں‘ بلکہ انہوں نے صرف کشتی کو سوراخ کر کے ظلم سے بچنے کی تدبیر کی تھی‘ اس لیے کہ ان کے پاس طاقت نہیں تھی کہ اس بادشاہ کے ظلم کا مقابلہ کر سکتے۔ ان کا کہنا تھا

کہ یہ فیصلہ اہلِ غزہ نے اپنے طور پر کیا تھا اس لیے اس کا خمیازہ بھی انہی کو بھگتنا ہوگا۔ ڈاکٹر یاسر جماعت نورسلفیہ کی طرف سے مصر کے رکن اسمبلی بھی رہے ہیں‘ اوران خیالات کا اظہار انہوں نے اس فتویٰ کے ردعمل میں کیا جو شیخ علی القرداغی نے جاری کیا تھا۔

یہ مسئلہ چونکہ حساس موضوع سے متعلق ہے‘ اس لیے تحقیق واحتیاط دونوں لازم ہیں۔ یہ فتویٰ اوراس پرڈاکٹر یاسر برہامی کا ردعمل‘ اس کا پس منظراور سیاق وسباق جانچنا ضروری ہے تاکہ درست معلومات حاصل کی جاسکیں۔

فتویٰ کی نسبت: شیخ علی القرداغی انٹرنیشنل یونین آف مسلم اسکالرز (IUMS) کے سیکرٹری جنرل رہے ہیں۔ ان کی قیادت میں یونین نے فلسطین کے حالیہ حالات میں جہاد اور مزاحمت کے حق میں فتاویٰ جاری کیے ہیں۔

فتویٰ کا خلاصہ: یہ فتاویٰ عام طور پر اہلِ غزہ کی مزاحمت کو ’’مشروع دفاعی جہاد‘‘ قرار دیتے ہیں‘ اور اُمّتِ مُسلمہ کو ان کی حمایت کا حکم دیتے ہیں‘ خاص طور پر جب فلسطینی عوام پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہوں۔

ڈاکٹر یاسر برہامی کا موقف: ڈاکٹر یاسر برہامی مصر کے ایک معروف سلفی عالم ہیں۔ دعوہ سلفیہ (نور پارٹی) سے وابستہ رہے اور مصری پارلیمنٹ کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ ان کا موقف سلفی مکتب فکر کے مخصوص سیاسی وفکری رجحانات کی نمائندگی کرتا ہے۔ خاص طور پر جہاں تک بین الاقوامی معاہدات‘ طاقت کی کمی‘ اور مسلح جہاد کی شرائط کا تعلق ہے‘ ان کا حوالہ دیا گیا ہے کہ: جہاد صرف اس صورت میں جائز ہے جب کوئی معاہدہ نہ ہو۔ اگر طاقت نہ ہو تو صبر اور دعا کی ہدایت دی گئی ہے۔ اہل غزہ نے دیگر اسلامی حکومتوں سے مشورہ نہیں کیا‘ لہٰذا اس کا نتیجہ بھی انہی کو بھگتنا ہوگا۔ یہ موقف عمومی سلفی سیاسی حلقوں کا نمائندہ ہے‘ خاص طور پر وہ حلقے جو مصری حکومت یا خلیجی ریاستوں کے قریب تر ہیں۔

قرآنی آیات وواقعات کے سیاق وسباق

(۱) ﴿وَاِنِ اسۡتَنۡصَرُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ فَعَلَيۡكُمُ النَّصۡرُ اِلَّا عَلٰى قَوۡمٍۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ‌ؕ﴾ (الانفال:۷۲)

’’اور اگر وہ تم سے دین کے معاملے میں مدد مانگیں تو اُن کی مدد کرنا تم پر واجب ہے‘ مگر کسی ایسی

قوم کے خلاف (نہیں) کہ اُن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو۔‘‘

یہ آیت صلح اور معاہدات کے احترام سے متعلق ہے‘ لیکن فقہاء نے جہادِ دفاعی کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جب ظلم وقتل عام جاری ہو۔

(۲) حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعات فردی حکمتِ عملی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کو جہاد یا مزاحمت کے اجتماعی احکام پر قیاس کرنا محلِ نظر ہے۔

انٹرنیشنل یونین آف مسلم اسکالرز کا فتویٰ

انٹرنیشنل یونین آف مسلم اسکالرز کا فتویٰ جہاد کے حق میں ہے اور یہ بھی درست ہے کہ اس کی اشاعت موجودہ حالات میں ہوئی۔

’’لجنة الاجتهاد والفتوى بالاتحاد العالمي لعلماء المسلمين تصدر فتوى في نازلة استمرار العدوان على غزة ونقض الهدنة، أهم ما تضمنته ما يلى:(۱) وجوب الجهاد بالسلاح ضد الاحتلال في فلسطين على كل مسلم مستطيع في العالم الاسلامي.(۲) وجوب التدخل العسكري الفوري من الدول العربية والاسلامية۔(۳) تحريم التطبيع مع الكيان الصهيوني المحتل تحريماً قطعياً۔‘‘

’’انٹرنیشنل یونین آف مسلم اسکالرز کی اجتہاد اور فتویٰ کمیٹی نے غزہ پر جاری حملوں اور جنگ بندی کی خلاف ورزی کے تناظر میں ایک فتویٰ جاری کیا ہے‘ جس کے اہم نکات یہ ہیں:(۱) فلسطین میں قابض قوت کے خلاف ہر مستطیع مسلمان پر مسلح جہاد واجب ہے۔(۲) عرب اور اسلامی ممالک پر فوری فوجی مداخلت واجب ہے۔(۳) صہیونی قابض ریاست کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات کو قطعی طور پر حرام قرار دیا گیا ہے۔‘‘

ڈاکٹر یاسر برہامی کا ردِّ عمل: ڈاکٹر یاسر برہامی کا موقف ہے کہ جہاد کی مشروعیت کے لیے طاقت اور استطاعت کا ہونا ضروری ہے۔ اگر مسلمان کمزور ہوں اور ان کے پاس مناسب طاقت نہ ہو تو مسلح جہاد کی بجائے صبر اور دعا کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ بین الاقوامی معاہدات کی پاس داری ضروری ہے۔ اگر کسی مسلم ملک نے کسی غیر مسلم ملک کے ساتھ امن معاہدہ کیا ہو تو اس معاہدے کی خلاف ورزی جائز نہیں‘ اِلّا یہ کہ معاہدہ توڑ دیا جائے یا اس کی مدت ختم ہو جائے۔ غزہ کی موجودہ صورت حال میں حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ بغیر مناسب تیاری اور علاقائی و

بین الاقوامی مشاورت کے مسلح کارروائیاں نقصان دہ ہو سکتی ہیں اور عام مسلمانوں کے لیے مزید مشکلات کا باعث بن سکتی ہیں۔

ان مسائل پر مختلف علماء کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہے‘ اور ہر موقف کے پیچھے مخصوص فقہی اور سیاسی دلائل موجود ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان آراء کا مطالعہ کریں‘ قرآن وسنت کی روشنی میں غور کریں‘ اور اپنے حالات کے مطابق دانش مندانہ فیصلے کریں۔

جہاد کے بارے میں قرآن وسُنّت کی تعلیمات

اسلامی فقہ میں جہادِ دفاعی اُس وقت فرض عین قرار پاتا ہے جب مسلمان مظلوم ہوں‘ دشمن نے سرزمین پر حملہ کر دیا ہو اور جان ومال‘ عزت ودین خطرے میں ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ﴾ (النساء:۷۵)

’’اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں‘ عورتوں اور بچوں کی خاطر جنگ نہیں کرتے جو ظلم کا شکار ہیں؟‘‘

یہ آیت واضح طور پر ظلم کے خلاف جہاد کی فرضیت کی دلیل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

((مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ عِرْضِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ دَمِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ)) (سنن الترمذی)

’’جو شخص اپنے مال‘ عزت یا جان کی حفاظت میں قتل کر دیا جائے‘ وہ شہید ہے۔‘‘

شرعی حیثیت

یہ فتویٰ مکمل طور پر قرآن کی مذکورہ آیات اور احادیث پر مبنی ہے۔ فلسطین میں دشمن نے حملہ کیا‘ معاہدات کی خلاف ورزی کی‘ لہٰذا مزاحمتی جہاد کی شرعی اجازت واضح ہے۔ اُمتِ مُسلمہ پر مدد لازم ہے۔

فقہی اصول: فقہ حنفی‘ شافعی‘ مالکی‘ حنبلی سب کے نزدیک‘ جب مسلمان کسی حملے کا شکار ہوں‘ اور وہ مدد مانگیں تو باقی مسلمانوں پر ان کی مدد فرض ہے (فرض کفایہ یا عین بن سکتا ہے)۔

ڈاکٹر یاسر برہامی کا موقف: طاقت کی کمی‘ معاہدات کی موجودگی اور حکمت کے تقاضے کو بنیاد بنا کر صبر‘ دعا اور عدم مزاحمت کی تلقین۔

فقہی تجزیہ: یہ موقف فقہی اصول ''درء المفاسد مقدم علی جلب المصالح'' (نقصان سے بچنا فائدہ حاصل کرنے سے زیادہ ضروری ہے) پر مبنی ہے۔ البتہ یہ اصول جہادِ دفاعی کی فرضیت کو معطل نہیں کرتا جب دشمن کھلی جارحیت پر اتر آئے۔

یہ موقف مظلوموں کو تنہا چھوڑنے اور استعمار کے سامنے جھکنے کے مترادف بن سکتا ہے۔ قرآن میں معاہدات کی پاس داری صرف اس وقت لازم ہے جب دشمن ان کی پابندی کر رہا ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَا اسۡتَقَامُوۡا لَـكُمۡ فَاسۡتَقِيۡمُوۡا لَهُمۡ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ۝﴾ (التوبۃ)

''تو جب تک وہ تمہارے لیے (اس پر) قائم رہیں تم بھی ان کے لیے (معاہدے پر) قائم رہو۔ بے شک اللہ متقین کو پسند کرتا ہے۔''

حتمی رائے: قرآن وسنّت کی روشنی میں انٹرنیشنل یونین آف مسلم اسکالرز کا فتویٰ زیادہ قابلِ رہنمائی ہے، کیونکہ یہ ظلم کے خلاف واضح موقف، شرعی بنیاد اور اُمت کی ذمہ داری کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر برہامی کا موقف احتیاط پسند اور ریاستی دباؤ میں محدود فہم پر مبنی معلوم ہوتا ہے، جو عوامی جدّوجُہد سے ہٹانے کے مترادف ہوسکتا ہے۔

قرآن وسُنّت کی روشنی میں جہاد اور فلسطین کی صورتِ حال

جہاد کی حقیقت: جہاد لغوی طور پر ''کوشش'' یا ''جِدّوجُہد'' کے معنی میں آتا ہے، اور اسلامی فقہ میں یہ اللہ کی راہ میں جنگ کرنے یا کوشش کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ جہاد کا بنیادی مقصد دین اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کی سلامتی کو یقینی بنانا ہے۔

قرآن وسُنّت میں جہاد کی تعریف

(۱) دفاعی جہاد: جب مسلمانوں کو غیر مسلم قوتوں کی طرف سے ظلم کا سامنا ہو۔ اور وہ اپنی زندگی، مال اور دین کی حفاظت کے لیے لڑیں، تو یہ دفاعی جہاد کہلاتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَقَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡمُعۡتَدِيۡنَ ۝١٩٠﴾ (البقرۃ)

''اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، لیکن حد سے تجاوز نہ کرو، کیونکہ اللہ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

(۲) ظلم کے خلاف جہاد: قرآن میں اس بات کا ذکر ہے کہ جب لوگ ظلم کا شکار ہوں تو ان کی مدد کرنا اور ظلم کے خلاف لڑنا واجب ہو جاتا ہے۔

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾﴾ (النساء)

’’اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں قتال نہیں کرتے اور ان مظلوم مردوں‘ عورتوں اور بچوں کی خاطر جو ظلم کے شکار ہیں‘ جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں نکال اس بستی سے جس کے رہنے والے ظالم لوگ ہیں۔ اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی بنا دے‘ اور ہمارے لیے خاص اپنے فضل سے کوئی مددگار بھیج دے۔‘‘

میڈیا کا کردار

بین الاقوامی میڈیا اکثر اسرائیلی بیانیے کو تقویت دیتا ہے‘ جس میں فلسطینیوں کو دہشت گرد اور اسرائیل کو مظلوم دکھایا جاتا ہے۔ البتہ الجزیرہ‘ پریس ٹی وی‘ TRT‘ اور چند آزاد صحافی فلسطینیوں کی اصل تصویر دنیا کو دکھا رہے ہیں۔ سوشل میڈیا نے اس بیانیے کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ عام فلسطینی نوجوان‘ ڈاکٹرز‘ اساتذہ‘ اور صحافی اپنی کہانیاں خود سنانے لگے ہیں‘ جس سے عالمی عوام کی رائے میں تبدیلی آئی ہے۔

فلسطین اور لبنان میں اسرائیلی مظالم صرف زمینی تنازع نہیں بلکہ یہ انسانیت‘ آزادی اور بین الاقوامی انصاف کے لیے ایک امتحان ہیں۔ ہزاروں معصوم جانوں کا ضیاع‘ لاکھوں بے گھر افراد‘ تباہ حال معیشت‘ اور بین الاقوامی برادری کی مجرمانہ خاموشی انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہے۔ اب وقت آ چکا ہے کہ عالمی طاقتیں‘ بین الاقوامی ادارے‘ اور بالخصوص مسلم دنیا اپنے ضمیر کو جھنجھوڑیں‘ اور اسرائیل کو اس کے جرائم کی سزا دینے کے لیے متحد ہو جائیں۔ اگر دنیا نے اپنی آنکھیں بند رکھیں تو فلسطین اور لبنان کے بعد ظلم کی یہ آگ باقی دنیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔

❁❁❁

اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جِدّ وجُہد اور تحریک چلانا ضروری ہے یا نہیں؟

تحریک اسلامی انقلاب کا استفتاء اور علماء کرام کے جوابات

استفتاء

(۱) اس وقت پاکستان میں اسلامی آئین نافذ ہے یا نہیں؟

(۲) اسلامی آئین کے نفاذ کی شرعی حیثیت اور ضرورت کیا ہے؟

(۳) اگر کسی ملک میں اسلامی آئین نافذ نہیں تو اس ملک کے عوام اور علماء ومشائخ پر از روئے شرع کیا ذِمہ داری عائد ہوتی ہے؟ نیز اس ذِمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہونے کی صورت میں ان کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟

(۴) اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جدّ وجُہد اور تحریک چلانا کس قدر ضروری ہے یا نہیں؟ اور اس جِدّ وجُہد میں مجروح یا مرجانے والے کا شرعی حکم کیا ہے؟

(۵) اگر کسی اسلامی ملک کا سربراہ اسلامی آئین نافذ نہیں کرتا تو اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ نیز اس سے تعاون یا اس کی مخالفت کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟

از محمد زمان

(ناظم قمر العلوم فریدیہ ماری پور روڈ' کراچی)

ان علماء کرام کے اسمائے گرامی جن کے جوابات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

(۱) مولانا بشیر احمد چشتی' خطیب اعظم' پنڈی گھیپ

(۲) مولانا مشتاق احمد چشتی' شیخ الحدیث انوار العلوم' ملتان

(۳) جناب پروفیسر ساجد میر' ناظم اعلیٰ جمعیت اہلِ حدیث پاکستان' لاہور

(۴) مولانا مفتی محمد رفیق الحسنی، مہتمم گلزار حبیب، کراچی

(۵) مولانا ابوالنصر منظور احمد، مہتمم جامعہ فریدیہ، ساہیوال

❀❀❀

سوال(۱) : کیا اس وقت پاکستان میں اسلامی آئین نافذ ہے یا نہیں؟

جواب:

❀ اب تک ملک پاکستان میں اسلامی نظام کی بو تک بھی نہیں آئی! جو کچھ بظاہر بتایا جاتا ہے وہ سب کچھ اسلام کے خلاف ایک مزاح ہے۔ (مولانا بشیر احمد چشتی)

❀ اس وقت پاکستان میں کامل طور پر اسلامی آئین نافذ نہیں ہے۔ چند جزوی شقیں نافذ ہیں لیکن بموجب ارشادِ خداوندی ''اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً''، مکمل طور پر اسلامی آئین نافذ کرنا ضروری ہے۔ (مولانا مشتاق احمد چشتی)

❀ پاکستان میں اس وقت مکمل اسلامی نظام نافذ نہیں ہے۔ (پروفیسر ساجد میر)

❀ یہ بات اظہر من الشّمس ہے اور دورِ حاضر کے سربراہ نے تسلیم بھی کیا ہے کہ اس وقت اسلامی آئین نافذ نہیں ہے، بلکہ رومی آئین نافذ ہے۔ عدالتیں اسی آئین کے قوانین کے مطابق فیصلے کرتی ہیں۔ وفاقی شرعی عدالت یا نظامِ زکوٰۃ جیسے امور کو اسلامی آئین کے نفاذ سے تعبیر کرنا اس مقدس آئین سے مذاق ہے اور عوام اور خلق کائنات سے بدعہدی کے ساتھ ساتھ دجل و مکر و فریب ہے۔ وَاللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ (مفتی محمد رفیق الحسنی)

❀ اللہ کرے پاکستان میں اسلامی نظام نافذ ہو، تاحال اس دولت سے محروم ہیں۔

(مولانا منظور احمد)

❀❀❀

سوال(۲) : اسلامی آئین کے نفاذ کی شرعی حیثیت اور ضرورت کیا ہے؟

جواب:

❀ اسلامی آئین قرآن پاک ہے، جس کا نفاذ کائناتِ ارضی پر خالقِ کائنات نے کر رکھا ہے۔ اس کے نیک بندے اسی کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ فقط باغیوں اور سرکشوں کے لیے سزا بظاہر نہیں مل رہی۔ اس کی جواب دہی قبر اور حشر میں ہم سب کی ہوگی! (مولانا بشیر احمد چشتی)

- اسلامی آئین کا نفاذ اس لیے ضروری ہے کہ اس ملک کا حصول خالصتاً اسلامی نظریے کے تحت ممکن ہوا' اور غالباً اس وقت کُرّۂ ارض پر پاکستان واحد ملک ہے جو خالصتاً اسلامی نظریے کے تحت معرضِ وجود میں آیا۔ لہٰذا یہاں اسلامی آئین نافذ نہ کرنا اس ملک کی اساس اور بنیادی مقصد سے غداری کے مترادف ہے۔ (مولانا مشتاق احمد چشتی)
- اسلامی آئین کا نفاذ شرعاً فرض ہے' کیونکہ جب کوئی اسلام قبول کرتا ہے تو اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اللہ کے بتائے ہوئے اصول وضوابط کے تحت گزارے گا۔

(پروفیسر ساجد میر)
- اسلامی آئین کا نفاذ فرضِ عین ہے' اس کا ترک استخفافاً واستحقاراً کفر ہے' اور کاہلی اور عذرِ غیر شرعی کی صورت میں گناہِ کبیرہ اور ظلم ہے۔ (مفتی محمد رفیق الحسنی)
- اسلام ہی حق آگاہی کا راستہ ہے جسے اختیار کیے بغیر حق شناسی ناممکن ہے۔ دنیوی کامیابی واُخروی نجات کا انحصار اسی میں مضمر ہے۔ (مولانا منظور احمد)

❁❁❁

سوال (۳): اگر کسی ملک میں اسلامی آئین نافذ نہیں تو اس ملک کے عوام اور علماء ومشائخ پر ازروئے شرع کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ نیز اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہونے کی صورت میں ان کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:

- بہت ہی عجیب سوال ہے۔ درحقیقت علماء اور مشائخ ہی فرقہ واریت' انانیت اور غفلت کی وجہ سے ذمہ دار ہیں! اسلام کا منشاء ساری دھرتی پر خدا تعالیٰ کے دین کا نفاذ ہے۔ جب تک ساری دھرتی پر اسلام نافذ نہیں ہوجاتا جہاد ساقط نہیں ہوتا۔ افسوس کہ منبر وخانقاہ کے اکثر مقامات پر سب باتیں ہوتی ہیں' سوائے جہاد کے! جہاد کے بغیر مسلمان قوم کبھی سرخرو نہ ہوئی ہے نہ ہوگی! سب مسائل کے باوجود جذبہ جہاد کے بغیر مؤمن کی موت ایمان پر نہ ہوگی! (مولانا بشیر احمد چشتی)
- اگر کسی اسلامی ملک میں اسلامی آئین نافذ نہ ہو تو اس ملک کے عوام' علماء اور مشائخ پر یہ

ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ حدودِ شرعی کی پابندی کرتے ہوئے ایسے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کریں جن سے اسلامی آئین کی راہ ہموار ہو سکے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خود شرعی احکام کی پابندی کی جائے اور پھر وقت کے حکمرانوں سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ بھی شریعت کے پابند بنیں اور ملک میں اسلامی آئین نافذ کریں۔(مولانا مشتاق احمد چشتی)

- جو ملک اسلامی آئین کی تجربہ گاہ کے طور پر بنایا گیا ہو' مگر اس میں اسلامی نظام نافذ نہ کیا جائے' تو عوام' مشائخ اور علماء کو ممکنہ حد تک اس کے نفاذ کے لیے جدّ و جُہد کرنی چاہیے۔ اس ذمہ داری کو محسوس نہ کرنا اور اس کے لیے عملی جِدّ و جُہد سے گریز کرنا ایمان کے تقاضے کی خلاف ورزی ہے۔(پروفیسر ساجد میر)
- اگر اسلامی ملک میں اسلامی آئین نافذ نہ ہو تو ملک کے عوام' علماء' مشائخ سب پر حسب استطاعت اسلامی آئین کے نفاذ کے لیے سعی اور کوشش واجب ہے۔ شرعی حدود میں رہتے ہوئے ہر وہ طریقہ کار اور عمل واجب ہے جس سے اسلامی آئین کا نفاذ ممکن ہو سکے۔ اگر عوام' مشائخ اور علماء اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرتے تو تارک الواجب ہونے کی وجہ سے گناہگار ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی آئین کے نفاذ کے لیے مساعی اور حسب حال کوششیں شروع کرنا ضروری ہے۔(مفتی محمد رفیق الحسنی)
- علماء و مشائخ' عوام و خواص سبھی پر لازم ہے کہ اس کے نفاذ کے سلسلہ میں میدانِ عمل میں آئیں اور امر بالمعروف' نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں۔(مولانا منظور احمد)

❁❁❁

سوال(۴) : اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جِدّ و جُہد اور تحریک چلانا کس قدر ضروری ہے یا نہیں؟ اور اس جِدّ و جُہد میں مجروح یا مر جانے والے کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب:

- اسلامی نظام کے نفاذ کی سعی فرضِ اوّلین ہے' بشرطیکہ اسلام کو سمجھا جائے۔ محض مُلّا کا اسلام فساد اور فرقہ واریت پر مبنی ہے۔ حالانکہ اسلام تسلیم و رضا اور ایمان و سلامتی کا نام ہے!

فساد و فتنہ دعویٰ ملکیت سے پیدا ہوتا ہے‘ ترکِ دعویٰ سے نہیں ہوتا۔ ہم سب خدا تعالیٰ کے خلیفہ فی الارض ہیں نہ کہ مطلق العنان مالک ہیں۔ ملائکہ نے اسی لیے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ تُو تو خلیفہ بنا رہا ہے اور یہ مالک بن بیٹھے گا۔ ساری کائناتِ ارضی پر دعویٰ ملکیت کا مزہ دیکھ لیں! تفصیلات کسی وقت پھر عرض کروں گا قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں! (مولانا بشیر احمد چشتی)

- اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے ہر ایسی پُرخلوص جِدّ و جہد کی جائے جو سیاسی مقاصد سے بالاتر ہو کر محض نظامِ مصطفیٰ ﷺ کو برسرِ اقتدار لانے کے لیے ہو۔ ظاہر ہے ایسے نیک مقصد کے لیے تکلیف اٹھانا یقیناً بہت بڑے اجر و ثواب کا موجب ہوگا۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ﴾ (التوبۃ: ۱۲۰) (مولانا مشتاق احمد چشتی)
- ایک مسلمان کے لیے دین کو بطور نظام نافذ کرانے کے لیے تن من دھن کے ساتھ پوری طرح کوشش کرنی چاہیے۔ اور اس راہ میں اگر کوئی تکلیف پہنچے تو انسان صبر کرتا رہے۔ اگر خالص رضائے الٰہی کے لیے ہے تو اس راہ میں موت‘ شہادت ہے۔ ان شاء اللہ! (پروفیسر ساجد میر)
- اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے تحریک اور ہر ایسی جِدّ و جُہد جو کہ شرعی حدود میں ہو‘ میں شریک ہونے والے مجاہدین اور ایسی جِدّ و جُہد میں مر جانے والے شہید ہوں گے۔ اور ایسی تحریک جس کی بنیاد ((مَنْ رَآی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ، اَوْ كَمَا قَالَ)) ہو‘ فرض ہے۔ (مفتی محمد رفیق الحسنی)
- نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے سلسلے میں کام آنے والے مجاہدین‘ شہیدین مقبولین بارگاہ ہیں۔ (مولانا منظور احمد)

❁❁❁

سوال (۵): اگر کسی اسلامی ملک کا سربراہ اسلامی آئین نافذ نہیں کرتا تو اس کے

متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ نیز اس سے تعاون یا اس کی مخالفت کرنا ازروئے شرع کیسا ہے؟

جواب:

❁ اسے نافذ نہ کرنے والے کے خلاف سعی کرنا ملّت کی استطاعت اور بصیرت کے ساتھ وابستہ ہے۔ مروّجہ سیاسی جماعتوں کا طریق تعاون اور مخالفت قطعی اسلام کے خلاف ہے! خدا تعالیٰ سچی اور کامل بصیرت و ہمت عطا فرمادے! (مولانا بشیر احمد چشتی)

❁ اگر کسی اسلامی ملک کا سربراہ اسلامی آئین نافذ نہیں کرتا تو نہ صرف یہ کہ وہ عنداللہ مجرم ہوگا بلکہ عندالخلق بھی اس سے جواب طلبی کی جائے گی۔ اور اس سے صرف اسی صورت میں تعاون کیا جائے گا جب کہ وہ اسلامی آئین کے نفاذ کے لیے کوئی مستحسن قدم اٹھانے پر تیار ہو جائے۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ﴾ (المائدۃ:۲) ”نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں باہمی تعاون کرو اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں معاون نہ بنو۔“ (مولانا مشتاق احمد چشتی)

❁ اگر کسی ملک کا مسلمان سربراہ اسلامی نظام نافذ نہیں کرتا تو وہ ظالم‘ کافر اور فاسق ہے۔ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۴۴ ……… وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۴۵ ……… وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴۷﴾ (المائدۃ) اس کے خلاف بھرپور جِدّ وجہد کرنی چاہیے۔ (پروفیسر ساجد میر)

❁ ایسے سربراہ اور حاکم وقت کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ اس کے ساتھ تعاون علی الاطلاق تعاون علیہ السلام ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے۔ بلکہ ایسی کوششیں ضروری ہیں جس سے وقت کا سربراہ اسلامی آئین نافذ کرنے پر مجبور ہو جائے۔ (مفتی محمد رفیق الحسنی)

❁ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کی راہ میں حائل ہونے والی ہر چھوٹی بڑی رکاوٹ کا ہٹانا نہایت ہی ضروری ہے۔ وَصَلَّى اللّٰہ تعالیٰ عَلٰی حبیبہٖ محمد وآلہ وأصحابہ وَسَلَّمَ (مولانا منظور احمد)

(شائع شدہ: میثاق‘ اگست ۱۹۹۴ء)

❁❁❁

اہل غزہ کی پکار
اسرائیلی درندے غزہ پر حملے کرنے سے تھکے نہیں، کیا ہم اسرائیل کو فائدہ پہنچانے والی کمپنیوں کی مصنوعات کے بائیکاٹ سے تھک چکے ہیں؟
حکومت پاکستان سیکیورٹی کونسل سمیت دیگر فورمز پر آواز اٹھانے کے ساتھ مسلم حکمرانوں کو مشترکہ عملی اقدامات کے لیے آمادہ کرے!
ظالم صہیونیوں کا علاج
معاشی نقصان نیز عسکری اقدامات اٹھانا ہے، جو او آئی سی کے چارٹر میں بھی طے شدہ ہے!
اگر خدانخواستہ سقوطِ غزہ ہوا......
تو اگلی باری عرب و دیگر مسلم ممالک کی اور آخری ہدف پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام اور میزائل ٹیکنالوجی ہوں گے!
The govts and establishments of Muslim countries
SHOULD TRUST IN ALLAH, NOT BE AFRAID OF AMERICA
and take practical measures to help the oppressed Palestinians!
On the basis of the bond of Islamic brotherhood, the public, all religious and political forces, rulers, and establishment
MUST UNITE
and take practical actions against Israel!
تنظیم اسلامی کا پیغام
خلافت راشدہ کا نظام
بانی تنظیم: ڈاکٹر اسرار احمدؒ
امیر تنظیم: شجاع الدین شیخ
تنظیم اسلامی
WWW.TANZEEM.ORG

+20

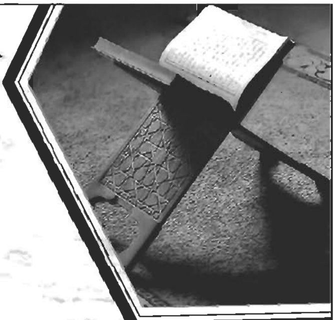

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

نگران: شجاع الدین شیخ حفظہ اللہ

رجوع الی القرآن کورس

تعارفی نشست

قرآن اکیڈمی ڈیفنس

13 اپریل 2025ء

بروز اتوار

صبح 09:30 بجے

آغاز درج ذیل اکیڈمیز میں

14 اپریل 2025ء

بروز پیر

صبح 08:45 تا دوپہر 01:00 بجے

دورانیہ 10 ماہ

پیر تا جمعہ

سال اوّل

- تجوید القرآن
- ترجمہ قرآن حکیم
- بیان القرآن
- منتخب نصاب
- عربی گرامر
- حدیث و سنت
- سیرت النبی ﷺ
- سیرت صحابہؓ
- عقیدہ و فقہ
- فکر اسلامی
- توسیعی محاضرات

سال دوم

- اصول التفسیر
- علوم القرآن
- اصول الحدیث
- اصول الفقہ
- اللغة العربية وأدبها
- علم العقیدہ
- تفسیر القرآن
- علم الحدیث
- فقہ العبادات والمعاملات
- الفکر الاسلامی

ہاسٹل کی سہولت قرآن اکیڈمی یٰسین آباد میں صرف حضرات کے لیے دستیاب ہے

info@QuranAcademy.edu.pk www.QuranAcademy.edu.pk

مقامات تدریس

قرآن اکیڈمی ڈیفنس: 0334-3088689, 021-35340022-24

قرآن اکیڈمی یٰسین آباد: 021-36806561, 021-36337361

قرآن اکیڈمی کورنگی: 0343-1216738, 021-35074664

قرآن انسٹیٹیوٹ گلستان جوہر: 0333-4030115, 021-34030119

قرآن انسٹیٹیوٹ بحریہ ٹاؤن: 0335-3318050, 0333-3145800

قرآن انسٹیٹیوٹ لطیف آباد: 0334-3350910, 0345-2701363

دارالاسلام مرکز تنظیم اسلامی لاہور: 0333-5632242, (042)35473375-78

May 2025
Vol.74

Regd. CPL No.115
No.5

Monthly **Meesaq** Lahore